صدقے واری
طاہر جاوید مغل

بار اوّل ——— ۲۰۰۳ء
مطبع ——— یوانیڈمی پرنٹرز، لاہور
کمپوزنگ ——— صوبا کمپوزنگ سنٹر، لاہور
قیمت ——— ۱۰۰ روپے

اسٹاکسٹ
علی بُک سٹال
نسبت روڈ، چوک میوہسپتال لاہور

ISBN 969-517-122-3

بڑی خوبصورت شام تھی' سردیوں کی دھوپ تیزی سے اپنی زرد چادر سمیٹ رہی تھی۔ دو دن پہلے تک بارش ہوتی رہی تھی لہٰذا اب ہر چیز خوب نکھری نکھری نظر آتی تھی۔ درخت' گلیاں' گھروں کی دیواریں اور چھتیں' بجلی کے کھمبے اور ٹی وی کے انٹینا' ہر شے چمک رہی تھی۔ نہ جانے کیوں سویرا کو یوں سر شام چھت پر آنے اور اس گنجان آبادی میں لہریں لیتی ہوئی زندگی کو ہولے ہولے شام کے جھٹپٹے میں گم ہوتے دیکھنے میں مزہ آتا تھا۔ جو جہاں پیدا ہوتا ہے اسے اس جگہ سے فطری طور پر کچھ زیادہ ہی لگاؤ ہوتا ہے۔ وہ بھی درمیانے درجے کی اسی بستی میں پیدا ہوئی اور پلی بڑھی تھی۔ شاید اسی لئے اسے یہ بستی پسند تھی.......... حالانکہ یہاں کوئی ایسی خاص بات نہیں تھی جو پسند کی جاسکتی۔ وہی ٹیڑھی میڑھی گلیاں' بے ترتیب مکانات یہاں وہاں شور مچاتے بچے اور خوانچہ فروشوں کی آوازیں..........! شہر کی یہ بستی اپنی تمام تر خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ سویرا کو اچھی لگتی تھی کیونکہ یہ اس کی اپنی بستی تھی۔

شام گہری ہونے لگی تو سویرا ہولے ہولے سیڑھیاں اتر کر اپنے کمرے میں آئی۔ یہ کمرا دوسری منزل پر واقع تھا۔ اس نے ایک بار پھر صندوق کھولا اور اپنے سامنے اپنی سیاہ اور نسواری رنگ کی شلوار قمیض پھیلالی۔ یہ شلوار قمیض اس نے اپنے جیب خرچ سے پیسے بچا بچا کر پچھلی چھوٹی عید پر سلوائی تھی۔ دوپٹا ابو نے لا دیا تھا۔ یوں اس کا سوٹ مکمل ہوگیا تھا۔ سیاہ اور نسواری رنگ کا امتزاج سویرا کو بہت پسند تھا۔ یہ سوٹ تو سلا بھی بہت پیارا تھا اور سویرا پر خوب جچا تھا۔ اس کے پاس درمیانے درجے کے دو جوڑے اور بھی تھے لیکن یہ جوڑا اسے زیادہ پیارا تھا۔ شاید اس لئے کہ یہ کسی اور کی نظر کو بھی پیارا لگا تھا' جس کی نظر کو یہ پیارا لگا تھا' اس کا نام احسن تھا۔ احسن' سویرا کا خالہ زاد تھا۔ سویرا

فرسٹ ایئر میں تھی جبکہ احسن بی کام کر رہا تھا۔ احسن اور سویرا دونوں کا تعلق کم آمدنی والے گھرانوں سے تھا۔ سویرا کے والد ایک سرکاری محکمے میں ہیڈ کلرک تھے اور آٹھ افراد پر مشتمل گھرانے کے واحد کفیل تھے۔ احسن کے والد فوت ہو چکے تھے۔ گاؤں میں ان کی تھوڑی سی زمین تھی جہاں سے اناج وغیرہ آتا تھا۔ احسن کی والدہ سلائی کڑھائی کے ذریعے گھر کا خرچ چلا رہی تھیں۔ ان کی ساری امیدیں اپنے بڑے بیٹے احسن سے وابستہ تھیں۔

احسن اور سویرا لڑکپن سے ہی چپکے چپکے ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے۔ احسن ایک خوش شکل لڑکا تھا مگر سویرا تو حسن و جمال کا مرقع تھی۔ اس کے دیگر بھائی بہن اچھے خاصے خوبصورت اور جاذب نظر ہونے کے باوجود اس کا پاسنگ بھی نہیں تھے۔ اگر اس کے جسم و جان پر مفلسی کی گرد نہ جمی ہوتی اور اس کے پاس ذرا وسائل اور مواقع ہوتے تو لاکھوں دلوں پر حکمرانی کرتی نظر آتی۔ موجودہ حالات میں وہ گدڑی کے لعل کی جیتی جاگتی تصویر تھی۔ وہ دونوں ابھی تک خاموش محبت کر رہے تھے۔ ہاں کبھی کبھار محبت کی اس خاموشی میں کوئی چھوٹا سا فقرہ' کوئی مسکراہٹ یا کوئی ادا دخل اندازی کرتی تھی۔ ایسا ہی ایک فقرہ چھوٹی عید کے موقع پر سویرا کے کانوں میں گونجا تھا۔ خالہ زبیدہ اور ان کے گھر والے سویرا کے گھر آئے تھے۔ احسن بھی تھا۔ برآمدے میں سویرا کے قریب سے گزرتے ہوئے اس نے آہستگی سے کہا تھا۔ "اچھی لگ رہی ہو۔"

یہ چار لفظ کئی دن تک سویرا کے کانوں میں رس گھولتے رہے تھے۔ سویرا کی والدہ اکثر بیمار رہتی تھیں۔ ویسے غربت اپنی جگہ بذات خود ایک بیماری ہے۔ سویرا کو گھر اور باہر کے بہت سے کام کرنے پڑتے تھے۔ پھر پڑھائی بھی تھی۔ اسے بہت کم فرصت ملتی تھی لیکن جب بھی فرصت ملتی' احسن کا فقرہ جلترنگ کی طرح اس کے کانوں میں گونجنے لگتا تھا "اچھی لگ رہی ہو۔"

پھر بسنت کے روز جب آسمان رنگ برنگی پتنگوں سے ڈھک گیا تھا اور بستی کی چھتوں پر دور تک سر ہی سر نظر آتے تھے۔ احسن پھر ان کے گھر آیا تھا۔ سویرا کے بڑے بھائی توقیر تو نوکری کی تلاش میں راولپنڈی گئے ہوئے تھے۔ ہاں دونوں چھوٹے بھائی گھر

میں تھے۔ احسن ان کے ساتھ دیر تک پتنگ بازی کرتا رہا تھا۔ اس روز وہ اپنے ساتھ کئی پتنگیں لایا تھا۔ ان میں سے زیادہ تر پتنگوں کے رنگ سیاہ اور نسواری تھے۔ اس نے سویرا کو سنانے کے لئے اس کے چھوٹے بھائی عدنان سے کہا تھا۔ "نہ جانے کیوں نانو! یہ کالے اور نسواری رنگ کی پتنگیں مجھے بڑی اچھی لگ رہی ہیں۔"

سویرا اس وقت دوسری منزل کے صحن میں حلیم کا سامان تیار کر رہی تھی۔ اسے اپنے کانوں کی لویں سرخ ہوتی محسوس ہوئی تھیں۔ جلدی سے اس نے اپنے کان اوڑھنی سے ڈھک لئے تھے۔ جیسے اسے ڈر ہو کہ چارپائی پر اونگھتی ہوئی والدہ اس کے کان دیکھ لیں گی یا اس کی چھوٹی بہن نادیہ عرف پنکی کی نگاہ اس کے کانوں پر پڑ جائے گی اور وہ چلا کر پوچھے گی۔ "آپی' آپ کے کان لال کیوں ہو گئے ہیں؟"

کچھ دیر بعد احسن اپنی پھٹی ہوئی پتنگ کے لئے گندھا ہوا آٹا ڈھونڈنے کے بہانے کچن میں آیا تھا۔ اس نے بڑی وارفتگی سے سویرا کو دیکھا تھا۔ پھر یہ فقرہ جیسے اچانک ہی اس کے لبوں سے پھسل گیا تھا۔ "آج پھر مجھے ذرا بال کھول کر اور وہ سوٹ پہن کر دکھا دو۔"

اس مختصر سے فقرے نے سویرا کو پوری بات سمجھا دی تھی۔ اس نے جواب میں کچھ کہنا چاہا لیکن ہونٹ تھرا کر رہ گئے۔ اس وقت نہ جانے اس کے منہ سے گھبراہٹ میں کیا نکل جاتا مگر اسی دوران میں صحن سے اس کی والدہ نے احسن کو آواز دے دی تھی۔ اس نے "جی اچھا" کہا تھا اور باہر نکلنے سے پہلے ایک بار پھر سویرا کی طرف دیکھ کر بولا تھا۔ "پلیز!" سالن پکانے کے بعد سویرا نے نہا کر کپڑے بدلے تھے.......... لیکن یہ وہ کپڑے نہیں تھے جن کی فرمائش احسن نے اس سے کی تھی۔ یہ زرد پھولوں اور اڑی اڑی سی رنگت والا ایک دوسرا جوڑا تھا۔ سویرا کوشش کے باوجود احسن کی فرمائش پوری نہیں کر سکی تھی۔ اسے ایسا لگا تھا کہ اگر اس نے احسن کی بات مان کر وہ جوڑا پہن لیا تو سارے گھر والوں کو ایک دم خبر ہو جائے گی بلکہ پورے محلے اور شہر کو خبر ہو جائے گی کہ اس نے یہ لباس احسن کے کہنے پر پہنا ہے۔

وہ نہا دھو کر باتھ روم سے نکلی اور برآمدے میں موجود بالشت بھر دھوپ میں کھڑی

ہوئی تھی تو احسن نے چھت کی منڈیر پر سے اسے دیکھا تھا۔ اس کے چہرے پر عجیب سی مایوسی پھیل گئی تھی۔ پھر وہ شام سے کچھ دیر پہلے ہی ان کے گھر سے واپس چلا گیا تھا۔ سویرا کو معلوم تھا کہ وہ اس سے ناراض ہو کر گیا ہے۔ وہ بھی افسردہ ہو گئی تھی۔ اس کے بعد وہ دیر تک سوچتی رہی تھی کہ اگر وہ احسن کی بات مان لیتی تو کیا قیامت برپا ہو جاتی تھی۔ آسمان پر ڈولتی ہوئی پتنگیں اور باجوں گاجوں کا شور اسے ایک دم ہی برا لگنے لگا تھا۔

بہرحال سویرا کی یہ افسردگی تادیر برقرار نہیں رہی۔ اس کے پاس افسردہ ہونے یا کسی بات کے بارے میں مسلسل سوچنے کا وقت ہی نہیں تھا۔ اس کے شب و روز کا ایک ایک پل ذمے داریوں اور مصروفیت میں جکڑا ہوا تھا۔ پڑھائی کی ذمے داری' بیمار والدہ کی ذمے داری' چھوٹے بہن بھائیوں کی دیکھ بھال اور اس کے علاوہ بھی بہت سے کام۔ اس طرح کئی ہفتے گزر گئے........ اور پھر ایک موقع ایسا آیا تھا جب وہ احسن کی فرمائش پوری کر سکتی تھی۔ اسے وہی سیاہ اور نسواری سوٹ پہن کر دکھا سکتی تھی اور اپنے کھلے بال شانوں پر ڈال سکتی تھی۔

سویرا کی بڑی پھپھو کے بیٹے کی شادی تھی۔ ظاہر ہے کہ اس شادی میں احسن سمیت سبھی کو آنا تھا۔ وہ چار روز پہلے ہی سویرا نے سوٹ دھو کر اچھی طرح استری کر لیا تھا........ اب صبح ان لوگوں کو شادی میں جانا تھا۔ صبح سے سویرا کئی مرتبہ سوٹ کو صندوق میں سے نکال کر دیکھ چکی تھی اور چپکے چپکے سوچ چکی تھی کہ احسن جب اسے اپنے من پسند کپڑوں میں دیکھے گا تو کتنا خوش ہو گا۔ وہ جانتی تھی کہ احسن کو بھی شدت سے شادی کی اس تقریب کا انتظار ہے۔ احسن کو یقیناً علم تھا کہ سویرا اس تقریب میں اپنی گزشتہ بے رخی کا ازالہ کر سکتی ہے۔ جو بات اس نے بسنت کے تہوار پر نہیں مانی تھی' وہ شادی کے دن مان سکتی تھی۔ احسن اور اس سیاہ نسواری لباس کے بارے میں سوچ سوچ کر سویرا کا دل عجیب انداز سے دھڑکنے لگا تھا جس کی وجہ شاید وہ خود بھی نہیں جانتی تھی۔ اسے احسن اور اس کی ضد پر پیار سا آنے لگا تھا۔ اس نے پہلے بھی کئی بار احسن کے بارے میں ایسے لطیف انداز میں سوچا تھا۔ احسن کی پیشانی پر جھکے ہوئے بال' اس کی بڑی بڑی بولتی ہوئی آنکھیں' اس کے ترشے ہوئے ہونٹ' اس کا رکا رکا سا انداز' سبھی کچھ

سویرا کو یاد آیا۔ وہ سوچنے لگی' شاید وہ سچ مچ احسن کو پسند کرنے لگی ہے۔ وہ پسندیدگی جو اب تک صرف ایک خالہ زاد سے منسوب تھی' اب لڑکی اور لڑکے والا پیار بن رہی تھی۔

اس نے ایک بار پھر کھوئے کھوئے انداز میں اپنے ملائم ریشمی سوٹ پر ہاتھ پھیرا۔ قمیض کو دو چٹکیوں میں کندھوں کے اوپر سے پکڑا اور اپنے سینے پر لگا کر آئینے کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ پھر اس نے قمیض کو نیچے رکھا' ربن میں بندھے ہوئے اپنے بالوں کو کھول دیا اور سر کو تین چار بار جھٹک کر بالوں کو کندھوں پر پھیلا لیا۔ اس کے بعد دروازے کو اندر سے کنڈی لگائی۔ پچھلی بقر عید پر اس نے جو لپ اسٹک خریدی تھی' وہ کنجوسی سے استعمال کے باعث ابھی تک بچی رکھی تھی۔ اس نے تھوڑی سی لپ اسٹک ہونٹوں پر لگائی اور سیاہ نسواری قمیض کو ایک بار پھر سینے پر پھیلا کر آئینے کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ ان لمحوں میں پتا نہیں کیوں وہ صرف اور صرف احسن کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ خود کو آئینے میں دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر بے اختیار ایک مدھم مسکراہٹ بکھر گئی۔

اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی۔

"کون؟" سویرا نے گھبرا کر پوچھا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے اپنا سیاہ نسواری سوٹ جلدی سے صندوق میں رکھ دیا تھا۔

دروازے کی دوسری جانب سے پنکی کی آواز آئی۔ "میں ہوں آپی!"

سویرا کی جان میں جان آئی۔ ورنہ وہ تو سمجھی تھی کہ بڑا بھائی توقیر ہو گا اور وہ کھانے میں تاخیر ہو جانے کے سبب اسے ڈانٹ پلانا شروع کر دے گا۔

سویرا نے جلدی جلدی ہونٹوں سے سرخی صاف کی اور دروازہ کھول دیا۔ پنکی نے تیز نظروں سے ارد گرد کا جائزہ لیا۔ "کیا ہو رہا تھا آپی؟"

"بس ذرا کپڑے بدلنے لگی تھی۔" سویرا نے بات بنائی۔

"ہائے' کتنے خوش قسمت ہوتے ہیں وہ لوگ جو کپڑے بدلتے ہیں۔" پنکی نے ٹھنڈی ٹھنڈی سانسیں بھریں۔

"کیوں' تیرے پاس کپڑے نہیں ہیں؟"

"توبہ ہے یا اللہ! آپ انہیں کپڑے کہتی ہیں آپی؟ مجھے لگتا ہے کہ ہمارے حالات

کے ساتھ ساتھ ہمارا ذوق بھی خراب ہوتا جا رہا ہے۔ کل ابو سوکھے سڑے مالٹوں کو موسمیاں کہہ رہے تھے اور ابھی تھوڑی دیر پہلے امی پیاز کے تڑکے والے چاولوں کو پلاؤ کا نام دے رہی تھیں.......... ہائے پلاؤ!" پنکی نے مزاحیہ انداز میں پھر ٹھنڈی سانس بھری۔

"خدا کا شکر کرو پنکی! اللہ کا دیا سبھی کچھ تو ہے۔" سویرا نے ناراضگی سے کہا۔ "کس چیز کی کمی ہے تمہیں؟"

"ایک عدد سوٹ کی.......... جو یہ ناچیز بندی کل ارمغان بھائی کی شادی خانہ آبادی پر پہن سکے.......... اف آپی! میں رات بھر خواب دیکھتی رہی ہوں' آپ کے کالے اور نسواری سوٹ کا.......... ساری رات جاگتی رہی ہوں اور وہ سوٹ میری نگاہوں کے سامنے گھومتا رہا ہے۔ کیا آپ.......... میرے لئے اتنی سی قربانی دے سکتی ہیں؟ پلیز آپی! میں ساری عمر بلکہ قیامت تک اور قیامت کے بعد بھی آپ کا احسان یاد رکھوں گی اور اگر.........." وہ کہتے کہتے خاموش ہوگئی۔

"اور اگر کیا؟" سویرا نے پوچھا۔

وہ ایک دم ہی سنجیدہ ہوتے ہوئے بولی۔ "آپی سچ مچ میرا دل چاہتا ہے کہ میں شادی پر ہی نہ جاؤں۔ امتحان بھی تو سر پر کھڑے ہیں.........." پنکی نے بڑی اداسی سے سر جھکا لیا۔

سویرا کچھ دیر تک خاموش نظروں سے پنکی کو دیکھتی رہی۔ وہ بدستور سر جھکائے بیٹھی تھی۔ دھیرے دھیرے سویرا کی آنکھوں میں پیار چمکنے لگا.......... پھر وہ ایک دم قہقہہ لگا کر بولی۔ "بڑی پاگل ہے تو.......... چھوٹی سی بات کو ایسے بڑھا چڑھا کر بیان کرتی ہے جیسے فلسطین یا کشمیر کا مسئلہ ہو۔ سوٹ کی بھلا کون سی بات ہے' میں وہ ہرا سلک والا پہن لوں گی۔"

"لیکن وہ تو آپ نے کئی جگہ پہنا ہوا ہے' سب کا دیکھا ہوا ہے۔"

"دیکھی.......... پچھلے مہینے میں نے اس پر نئی لیس لگائی تھی' بالکل نیا لگ رہا ہے۔"

"آپ دکھائیں مجھ کو وہ سوٹ!"

"تو کیا میں جھ ٹ بول رہی ہوں؟"

"نہیں آپی دکھائیں۔"

سویرا نے دوبارہ صندوق کھولا اور سبز سلک کا سوٹ نکال کر پنکی کو دکھایا۔ وہ قدرے مطمئن نظر آنے لگی۔ سویرا نے ایک بار پھر کھوئے کھوئے انداز میں اپنے کالے نسواری سوٹ پر ہاتھ پھیرا اور بڑی محبت سے پنکی کے حوالے کردیا۔ پنکی اس سے لپٹ گئی۔ اس کے گال کا بوسہ لیا اور قلانچیں بھرتی ہوئے کمرے سے نکل گئی۔ سویرا کی اب تک کی زندگی ایسی ہی چھوٹی بڑی قربانیوں سے بھری ہوئی تھی۔ اپنے گھر والوں اور بہن بھائیوں کے لئے ایسی قربانیاں وہ بڑے خلوص اور چاہت سے دیا کرتی تھی۔

شادی کے روز نہ جانے کیوں' وہ دل ہی دل میں تھوڑا تھوڑا ڈر رہی تھی۔ وہ احسن کو دیکھنا چاہتی تھی لیکن اس کا سامنا کرنا نہیں چاہتی تھی۔ وہ جانتی تھی' وہ پہلے ہی خفا خفا ہے' اب اور بھی ناراض ہو جائے گا۔ عورتوں کے کمرے میں جالی کی اوٹ سے اس نے احسن کو دیکھا' وہ گلی میں لگے شامیانوں کے نیچے کھڑا تھا اور سویرا کے چھوٹے بھائی عدنان سے باتیں کررہا تھا۔ باتوں کے ساتھ ساتھ اس کی نگاہیں اِدھر اُدھر بھی گردش کررہی تھیں۔ یقیناً وہ عورتوں اور لڑکیوں میں سویرا کو تلاش کررہا تھا۔ کالے اور نسواری سوٹ کے ساتھ کھلے بالوں کو تلاش کررہا تھا۔ پھر اچانک اسے کالا نسواری سوٹ نظر آیا تھا۔ جالی کی اوٹ سے اس نے احسن کو صاف چونکتے ہوئے دیکھا' وہ روشنی میں کھڑا تھا۔ پنکی کم روشنی والے حصے کی طرف سے آرہی تھی۔ احسن دھیان سے اس کی جانب دیکھ رہا تھا' پھر اس نے پہچان لیا کہ وہ سویرا نہیں پنکی ہے۔ سویرا سے احسن کا فاصلہ کافی زیادہ تھا پھر بھی اس نے احسن کے چہرے پر مایوسی کا سایہ لہراتے ہوئے صاف دیکھا۔ وہ منہ پھیر کر ایک بار پھر عدنان سے باتیں کرنے لگا۔

شادی کی ساری تقریب میں سویرا نے فقط ایک بار احسن کی جھلک دیکھی۔ بارات لڑکی والوں کے گھر پہنچی تو وہ بارات کی ایک ویگن سے اتر رہا تھا۔ اس کے بعد سویرا کی نگاہیں اسے ڈھونڈتی ہی رہیں' وہ آخر تک دکھائی نہیں دیا۔ غالباً نکاح کی رسم کے فوراً بعد وہ رخصت ہوگیا تھا۔ ولیمے کے روز بھی سویرا نے اس کی بس ایک جھلک ہی دیکھی۔ وہ بھی بس اتفاق ہی ہوگیا تھا۔ سویرا کا سب سے چھوٹا بھائی دانش کہیں کھیلتا ہوا باہر نکل گیا

تھا۔ سویرا کو اس کی غیر موجودگی کا احساس ہوا تو ڈھونڈتی ہوئی باہر نکلی۔ گھر کے بیرونی دروازے پر ہی اس کی ملاقات احسن کی امی یعنی خالہ زبیدہ سے ہوگئی۔ سویرا نے روہانسی آواز میں کہا۔ "خالہ! آپ نے دانش کو تو نہیں دیکھا؟"

خالہ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ ابھری۔ "تجھے تو بس بہن بھائیوں کی فکر ہلکان کئے رہتی ہے۔ وہ ادھر سامنے والے جنرل اسٹور پر دوسرے بچوں کے ساتھ کھڑا ہے' ابھی آجاتا ہے۔"

سویرا کے سینے سے اطمینان کی طویل سانس نکلی تھی۔ چھوٹے بہن بھائیوں کی فکر ایسے ہی ایک دم اس کی جان نچوڑ لیا کرتی تھی۔ یہی وقت تھا جب اس کی نگاہ خالہ کے عقب میں احسن پر پڑی۔ دونوں کی نگاہیں ایک لمحے کے لئے ملیں۔ احسن کی نگاہ میں سنگین ترین شکووں کی بجلی چمکی اور سویرا کی پلکیں خودبخود جھک گئیں۔

"کیابات ہے' تم دونوں بات نہیں کرتے ہو؟" خالہ زبیدہ نے مسکرا کر پوچھا۔

"السلام علیکم احسن!.......... بھیہ.......... بھائی!" سویرا نے کہا۔

احسن نے سر کے اشارے سے جواب دیا اور جلدی سے اندر چلا گیا۔

سویرا کا دل جیسے کٹ کر رہ گیا تھا۔

سویرا کو اندازہ ہوا تھا کہ احسن ضرورت سے کچھ زیادہ ہی خفا ہوگیا ہے۔ اس کی خفگی کی وجہ اچانک ہی سویرا کے ذہن میں آئی تھی۔ یہ وجہ سمجھ میں آنے کے بعد سویرا کی پریشانی میں اضافہ ہوگیا۔ ایک مرتبہ باتوں باتوں میں خالہ زبیدہ نے کہا تھا کہ پنکی مسور کی دال بڑی اچھی پکاتی ہے اور مسور کی دال میری سب سے پسندیدہ ڈش ہے۔

سویرا کی امی نے کہا تھا کہ تو پھر ٹھیک ہے' اس کو اپنے گھر لے جانا اور مسور کی دال پکوا پکوا کر کھاتی رہنا۔

امی کا اشارہ سمجھتے ہوئے احسن نے فوراً کہا تھا۔ "مجھے تو مسور کی دال بالکل اچھی نہیں لگتی بلکہ کوئی بھی دال اچھی نہیں لگتی۔"

اس واقعے کے بعد سویرا اکثر احسن کو ڈھکے چھپے الفاظ میں چھیڑا کرتی تھی۔ وہ باتوں باتوں میں مسور کی دال کا ذکر کرتی اور احسن اسے گھور کر رہ جاتا تھا۔ آج اس بارے میں

سوچتے سوچتے اچانک سویرا کے ذہن میں یہ بات آئی تھی کہ احسن کی غیر معمولی ناراضگی کی وجہ کیا ہے۔ ایک تو اس نے احسن کی درخواست اور پُرزور خواہش کے باوجود اس کے پسندیدہ کپڑے نہیں پہنے تھے' دوسرے وہ پسندیدہ کپڑے اس نے پنکی کو پہنا دیئے تھے۔ دوسرے معنوں میں اس نے ڈھکے چھپے الفاظ میں احسن کو پیغام دیا تھا کہ وہ اس کے بجائے پنکی کو اپنی توجہ کا مرکز بنائے کیونکہ بڑوں کی خواہش بھی شاید یہی ہے۔

یہ بات سمجھ میں آنے کے بعد سویرا کی پریشانی میں اضافہ ہوا۔ کئی روز تک بار بار اسے احسن کی شکوہ کناں نگاہیں یاد آتی رہیں۔ اس نے سوچا کہ اسے احسن کی یہ غلط فہمی دور کرنی چاہئے۔ اسے بتانا چاہئے کہ اصل بات کیا تھی' مگر کیسے؟ احسن کے ساتھ ملنے کے مواقع بہت کم تھے اور اگر کبھی ملاقات ہوتی بھی تھی تو سویرا کی زبان کو تالا لگ جاتا تھا۔ وہ کئی دن تک اپنے آپ میں کڑھتی رہی لیکن پھر جلد ہی سب کچھ بھول گئی۔ اس کی زندگی میں مصروفیت اتنی زیادہ تھی کہ کوئی بھی خیال تادیر اس کے دماغ میں رہ نہیں سکتا تھا۔

والدہ کی بیماری کی وجہ سے پورے گھر کی ذمے داری چھوٹی عمر میں ہی سویرا کے کندھوں پر آگئی تھی۔ کالج سے آتے ہی وہ پنکی کے ساتھ مل کر گھر کے کام میں جت جاتی تھی۔ کپڑے دھونا' گھر کی صفائی' کچن سنبھالنا' چھوٹے بہن بھائیوں کو ہوم ورک کرانا' یہ سب کچھ درحقیقت سویرا ہی کے ذمے تھا۔ پنکی اور عدنان تھوڑا بہت ہاتھ بٹاتے تھے لیکن سویرا کو بڑی جلدی ان پر ترس آجاتا تھا اور وہ عدنان کو کھیلنے کودنے اور پنکی کو ٹی وی دیکھنے کے لئے آزاد کردیتی تھی۔ شام کے بعد وہ تھک کر چُور ہوتی تھی لیکن اس وقت اسے اپنی پڑھائی کرنا ہوتی تھی۔ اس پڑھائی کے دوران میں بھی وہ گاہے گاہے گھر کے کام کاج کو دیکھتی رہتی۔ کبھی امی کو دوا پلا رہی ہے' کبھی ابو کے لئے چائے بنا رہی ہے۔ ابو تو کسی اور کے ہاتھ کی چائے پیتے ہی نہیں تھے۔ امی کو بھی صرف سویرا ہی دوا پلا سکتی تھی۔

رات گئے جب وہ روزمرہ کے بچے کھچے کام نمٹا کر بستر پر لیٹتی تھی تو بدن کا جوڑ جوڑ ٹوٹتا محسوس ہوتا تھا۔ اس کے ساتھ ہی اگلے روز کی فکریں بھی ہوتی تھیں۔ کس کس کا کون کون سا کپڑا استری کرنے والا ہے۔ کس کس بچے نے اپنا "اسکول بیگ" چیک نہیں کیا ہے۔ صبح ناشتے سے کیسے عہدہ برآ ہونا ہے وغیرہ وغیرہ۔ یہی کچھ سوچتے سوچتے نیند

آدبوچتی تھی۔ اس طرح کے لگے بندھے معمول میں کسی نازک خیال کی مہلت کہاں ملتی ہے۔ کوئی یاد دل کے دروازے پر دستک دیتی بھی تھی تو اس کی آواز سویرا کے کانوں تک کم ہی پہنچتی تھی۔

ایک روز احسن سے سویرا کا اچانک ہی سامنا ہوگیا۔ وہ کالج سے لوٹی تھی۔ اس دن ٹسٹ تھا اس لئے جلدی فارغ ہوگئی تھی۔ وہ دو بسیں بدل کر گھر پہنچتی تھی۔ پہلی بس سے اتر کر وہ تھکے تھکے قدموں سے دوسری بس کے اسٹاپ کی طرف جا رہی تھی کہ اچانک اسے یاد آیا کہ آج تو عدنان اور زلفی کے اسکول میں والدین اور اساتذہ کی میٹنگ کا دن ہے۔ اس طرح کی میٹنگز اٹینڈ کرنا بھی سویرا ہی کی ذمے داری تھی۔ آٹھ سالہ عدنان اور پانچ سالہ زلفی کا اردو میڈیم اسکول زیادہ فاصلے پر واقع نہیں تھا۔ وہ بس پر بیٹھنے کے بجائے پیدل ہی اسکول کی طرف روانہ ہوگئی۔ نوجوانانِ قوم کی تیز برمے جیسی نگاہوں کی شدید چبھن اپنے چہرے پر محسوس کرتی، ابھی وہ ڈیڑھ دو سو گز آگے ہی گئی تھی کہ اس کی نگاہ احسن پر پڑگئی۔ وہ اپنی خستہ حال موٹر سائیکل کا پنکچر لگوانے میں مصروف تھا۔ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ احسن پہلے تو چونکا پھر اس نے نگاہیں پھیرلیں۔ پہلے تو سویرا کا دل بھی یہی چاہا کہ وہ انجان بن کر اس کے پاس سے گزر جائے لیکن پھر اس سے رہا نہیں گیا۔

وہ دل کڑا کر کے اس کے قریب چلی گئی "السلام علیکم!" اس نے قریب جا کر کہا۔

احسن نے شاید وعلیکم السلام ہی کہا تھا تاہم سویرا کو بس اس کے ہونٹ ہلتے ہی دکھائی دیئے۔ آواز سویرا کے کانوں تک نہیں پہنچی تھی۔

"یہاں کیا کر رہے ہیں؟"

"تمہیں بھی نظر آرہا ہے کہ کیا کر رہا ہوں۔" وہ جلے کٹے لہجے میں بولا۔

"کیا بات ہے، میں نے آپ سے کچھ کہہ دیا ہے جو اس طرح بول رہے ہیں؟"

"میں بالکل ٹھیک بول رہا ہوں۔ تمہارے سننے میں فرق ہے۔"

"بہت دن ہوئے آپ گھر بھی نہیں آئے۔ شاید کسی بات کا غصہ ہے آپ کو۔"

"نہیں میں بہت خوش ہوں۔ کہو تو یہاں سب کے سامنے قہقہے لگا دکھا دوں؟" وہ

"ٹھیک ہے.......... میں نے ہی آپ سے بات کر کے غلطی کی ہے، ویری سوری!" سویرا نے کہا اور تیزی سے آگے بڑھ گئی۔ احسن نے اس کی طرف مڑ کر دیکھنے کی زحمت بھی نہیں کی۔

گھر آکر سویرا نے کمرا بند کیا اور بہت دیر تک گم صم بیٹھی رہی۔ یہاں تک کہ اس کا چھوٹا بھائی زلفی دروازہ کھٹکھٹانے لگا۔ ہمسائے کے لڑکے نے اس کی پتنگ چھین لی تھی اور وہ "آپی" کے نام کی دہائی دے رہا تھا۔ سویرا یہ جھگڑا نمٹانے کے لئے چھت پر چلی گئی۔ چھت ہی پر اسے اپنے بڑے بھائی توقیر کی زبانی یہ پریشان کن خبر ملی کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے احسن کی موٹر سائیکل کا ایکسیڈنٹ ہوگیا ہے اور احسن کو چوٹیں آئی ہیں۔

ابھی کوئی ڈیڑھ گھنٹا پہلے ہی تو سویرا اس سے مل کر آئی تھی۔ اس وقت احسن بہت غصے میں دکھائی دیا تھا۔ عین ممکن تھا کہ اسی غصے اور جھلاہٹ کے عالم میں اس نے موٹر سائیکل چلائی ہو اور ایکسیڈنٹ کر بیٹھا ہو۔ ایک دم سویرا خود کو اس ایکسیڈنٹ کے لئے قصور وار سمجھنے لگی۔ وہ لوگ شام کو احسن کو دیکھنے اسپتال گئے۔ وہ میو اسپتال کے ہڈی وارڈ میں تھا۔ دونوں کلائیوں میں ہلکے سے فریکچر ہوئے تھے۔ باقی جسم پر بھی چھوٹی بڑی خراشیں موجود تھیں۔ احسن کے بستر کے گرد رشتے دار خواتین کا رش تھا۔ وہ خواتین کے پیچھے سے احسن کو دیکھ رہی تھی۔ وہ کافی دیر انتظار کرتی رہی پھر احسن کی نگاہ اس سے ملی۔ ان نگاہوں میں ابھی تک ناراضگی کروٹیں لے رہی تھی۔ نہ جانے کیوں ان لمحوں میں سویرا کو احسن پر بے تحاشا پیار آیا۔ وہ اسے ایک چھوٹے ضدی بچے کی مانند لگا۔

چوتھے پانچویں روز احسن اسپتال سے گھر آگیا۔ جب وہ گھر آیا تو سویرا اور اس کی امی وغیرہ پھر احسن کو دیکھنے گئے۔ اس روز سویرا نے نہ صرف احسن کی خاطر وہ سیاہ اور نسواری سوٹ پہنا بلکہ احسن کی خواہش کے مطابق.......... اس نے اپنے بال شانوں پر کھلے بھی چھوڑ دیئے تاہم انہیں دوپٹے سے ڈھانپ دیا۔ وہ لوگ احسن کے گھر پہنچے۔ احسن کا گھر اسی بستی میں واقع تھا جہاں سویرا رہتی تھی۔ تاہم سویرا کا گھر شمالی کنارے پر اور احسن کا بستی کے جنوبی کنارے پر تھا۔ دونوں گھروں کے درمیان کم و بیش نصف میل کا فاصلہ تھا۔

احسن کے سامنے جاتے ہوئے سویرا کو عجیب سی شرم محسوس ہو رہی تھی۔ اس کے کانوں کی لویں سرخ ہو گئی تھیں۔ احسن بستر پر نیم دراز تھا۔ اس نے چونک کر سویرا کی طرف دیکھا اور ایک دم اس کے چہرے پر روشنی پھیل گئی۔ ایک ہی لمحے میں احسن کی آنکھوں نے سویرا کو بتا دیا کہ وہ سویرا کو اس روپ میں دیکھ کر نہال ہو گیا ہے۔ وہ اتنی وارفتگی سے اسے دیکھ رہا تھا کہ سویرا کو ڈر محسوس ہونے لگا کہ کوئی اسے یوں دیکھنے پر ٹوک نہ دے۔ سویرا غیر ارادی طور پر اپنی والدہ کی اوٹ میں ہو گئی۔ یہ ایک خاموش اظہارِ محبت تھا جو اس روز سویرا نے کیا تھا۔

دن گزرتے رہے۔ روز و شب ایک دوسرے کے پیچھے دوڑتے رہے۔ سویرا اور احسن کی محبت بھی چھوٹی چھوٹی خوشیوں اور دکھوں کے درمیان آگے بڑھتی رہی۔ بے شک سویرا' احسن سے محبت کرتی تھی۔ وہ اس کے سپنے دیکھتی تھی۔ اس کے ساتھ زندگی گزارنا چاہتی تھی لیکن اس کی ذات کئی حصوں میں بٹی ہوئی تھی اور اس کے ساتھ ہی اس کی محبت بھی شاید منقسم تھی۔ اپنی بیمار والدہ کی خدمت' والد کے آرام کا خیال' چھوٹے بہن بھائیوں کی دیکھ بھال' اسے بے شمار اطراف میں دھیان رکھنا پڑتا تھا.........

ان گوناگوں مصروفیات میں کبھی کبھی احسن کی محبت یوں چمکتی تھی جیسے گھٹا ٹوپ بادلوں میں بجلی اپنی جھلک دکھا کر غائب ہو جائے۔ رات کو تھک ہار کر جب وہ بستر پر لیٹتی تو کبھی کبھی مستقبل کا ایک حسین سپنا اس کی آنکھوں میں بس جاتا۔ وہ تصور کی نگاہ سے دیکھتی کہ اس کی امی صحتمند ہیں' ابو کی پیشانی سے پریشانی کی سلوٹیں معدوم ہو چکی ہیں......... دونوں ہنس ہنس کر باتیں کر رہے ہیں۔ توقیر بھائی کی نوکری لگ چکی ہے۔ ابو کے دیرینہ خواب کے مطابق ننھے زلفی کو ایک اچھے اسکول میں داخلہ مل گیا ہے۔ اس کے سارے چھوٹے بہن بھائی صاف ستھرے نئے کپڑوں میں ملبوس ہیں' وہ گھر کے صحن میں بیٹھی ہے۔ احسن اندر داخل ہوتا ہے۔ چپکے سے اس کے کان میں کہتا ہے' لے' اب تو تیری ساری ذمے داریاں پوری ہو گئیں' توقیر بھائی کی شادی ہونے والی ہے۔ اب تُو بھی سرخ جوڑا پہننے کا سوچ......... بتا کب بارات لے کر آؤں تیری گلی میں؟ وہ شرم سے دہری ہو جاتی ہے۔

پھر کبھی کبھی کالج جاتے یا واپس آتے ہوئے' اس کی نگاہیں خوامخواہ ہی راستوں میں

احسن کو ڈھونڈنے لگتیں۔ اس کا دل چاہتا وہ کہیں راستے میں کھڑا مل جائے۔ اسے اپنے ساتھ چلنے کا کہے۔ وہ اس کی موٹر سائیکل پر بیٹھے اور اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر پورا شہر گھومے......... سویرا کے ساتھ موٹر سائیکل پر بیٹھنا احسن کا بھی ایک دیرینہ خواب تھا بلکہ اس نے تو یہ موٹر سائیکل شاید رکھی ہی اس کے لئے تھی۔ اسے امید تھی کہ ایک نہ ایک دن ایسا ضرور آئے گا جب سویرا موٹر سائیکل پر اس کے پیچھے بیٹھے گی اور وہ دونوں ایک لمبی سیر پر نکلیں گے۔

احسن کے ساتھ موٹر سائیکل پر بیٹھ کر گھومنے کا خیال جب سویرا کے ذہن میں آتا تو اس کی نگاہوں میں اپنے ابو کا چہرہ گھوم جاتا۔ وہ ان کو دکھ دینے کا سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ پھر اس کے بھائی جان توقیر تھے۔ وہ احسن کو کچھ زیادہ پسند نہیں کرتے تھے۔ اگر وہ اسے احسن کے ساتھ گھومتے دیکھ لیتے تو نہ جانے کیسا سخت ردعمل ظاہر کرتے۔

انہی دنوں سویرا کے ابو شدید بیمار ہو گئے۔ سانس کی تکلیف انہیں کبھی کبھار ہو جاتی تھی لیکن اس مرتبہ یہ تکلیف اتنی شدت سے ابھری تھی کہ وہ بستر سے لگ گئے۔ دراصل سخت سردی میں وہ کسی دفتری کام کے لئے لاہور سے اسلام آباد گئے تھے۔ بچت کے خیال سے انہوں نے فلائنگ کوچ کے بجائے ٹرین کا سفر کیا۔ راستے میں سردی لگی اور بخار ہو گیا۔ دو دن بعد واپس لاہور پہنچے تو ان کی سانس سینے میں نہیں سما رہی تھی۔

سویرا نے ان کی خدمت گزاری میں دن رات ایک کر دیا۔ ان دنوں اسے اپنے تن من کا ہوش ہی نہیں رہا تھا۔ گھر کے باقی افراد بھی اپنی اپنی ہمت کے مطابق اس کا ساتھ دے رہے تھے۔ مگر اصل ذمے داری تو اسی پر تھی۔ توقیر نوکری کی تلاش میں شہر سے باہر تھا۔ گھر میں سبھی کچھ سویرا کو سنبھالنا پڑ رہا تھا۔

ایک دن وہ کمرے میں بیٹھی رو رہی تھی کہ اچانک احسن آ گیا۔ اس کی آواز سنتے ہی سویرا نے جلدی سے آنسو پونچھ لئے تھے۔ احسن نے پھر بھی بھانپ لیا۔ "کیا بات ہے سویرا؟ تمہاری آنکھیں سرخ ہو رہی ہیں؟"

"کچھ نہیں' ذرا سو گئی تھی۔"

"یہ سرخی سونے کی نہیں' نہ سونے کی لگتی ہے۔" احسن نے کہا۔

عدنان فوراً بولا۔ "میں بتاتا ہوں احسن بھائی جان! آپی رو رہی تھیں۔ ان کا پرس خالی ہوگیا ہے ناں۔"

"پرس خالی ہوگیا ہے' کیا مطلب؟"

"ان کے سارے پیسے ختم ہوگئے ہیں۔"

"ختم کیسے ہوگئے؟"

زلفی توتلی زبان میں بولا۔ "ابو دان کی دوائیاں جو آگئی ہیں۔"

زلفی نے بڑی سادگی سے اصل بات بتا دی تھی۔ احسن خالی خالی نظروں سے سویرا کا چہرہ تکنے لگا۔ کتنی سادہ لیکن باوقار نظر آ رہی تھی وہ.......... احسن کو یوں لگتا تھا جیسے غمزدہ ہو کر وہ اور بھی حسین ہو جاتی ہے۔

احسن نے سویرا سے پوچھا۔ "سویرا! کیا واقعی پیسوں کا مسئلہ ہے؟"

وہ بولی۔ "پیسوں کا نہیں احسن' ابو کی صحت کا مسئلہ ہے۔ وہ اب بھی ٹھیک نہیں ہیں۔ میں نے تھوڑے تھوڑے کرکے پانچ چھ ہزار جمع کئے تھے۔ خیال تھا کہ فروری مارچ تک امی کے گردے کا آپریشن کرالیں گے۔ ڈاکٹر نے کہا تھا کہ آپریشن کو اس سے زیادہ لیٹ نہیں کیا جاسکتا.......... اب وہ سارے پیسے بھی لگ گئے ہیں۔"

"مجھے پہلے ہی اندازہ تھا سویرا کہ پیسوں کا مسئلہ ہوگا۔ توقیر بھائی کو نوکری نہیں ملی۔ خالو جان کی تگی بندھی تنخواہ سے ہی گزارہ ہوتا ہے' اب وہ بھی بیمار ہیں۔"

"کوئی بات نہیں' اللہ مدد کرے گا۔" سویرا نے آنسو پیتے ہوئے کہا۔

"کیا تم نے کبھی انگریزی زبان کا وہ مشہور مقولہ نہیں سنا؟ God Helps Those Who Help Themselves یہ دنیا اسباب کی دنیا ہے سویرا۔ اللہ کی مدد تو یقیناً ہر کام میں درکار ہوتی ہے لیکن اس کے علاوہ ہمیں خود بھی کچھ نہ کچھ کرنا پڑتا ہے۔ میں نے **ایک فیصلہ** کیا ہے سویرا! میں اپنی موٹر سائیکل بیچ دوں گا۔"

"وہ کیوں؟"

"جو تمہاری امی ہیں وہ میری خالہ ہیں' کچھ نہ کچھ میرا بھی حق ہے ان پر۔ میں جانتا ہوں' ان کے گردے کا آپریشن وقت پر ہونا بہت ضروری ہے۔ ان کا آپریشن میں کراؤں

گا۔"

"پلیز احسن! ایسی باتیں مت کریں۔ میں جانتی ہوں کہ یہ موٹر سائیکل آپ کے لئے کتنی اہم ہے۔ آپ کے گھر میں یہ واحد سواری ہے۔ ویسے بھی ابھی حالات ایسے برے نہیں ہیں کہ آپ کو اس طرح کا قدم اٹھانا پڑے۔"

اس واقعے کے تین روز بعد ہی میو اسپتال کے ایک ٹھٹھرے ہوئے وارڈ میں سویرا کے ابو اسے اور اس کے بہن بھائیوں کو ہمیشہ کے لئے چھوڑ گئے تھے۔ سویرا اور اس کے پانچوں بہن بھائی یتیم ہوگئے تھے۔ ڈاکٹروں کا کہنا تھا کہ ان کی موت دراصل دل کے دورے سے واقع ہوئی ہے۔ جب ان کا بلڈ پریشر بہت نیچے آگیا اور سانس سینے میں رکنے لگی تو ابو نے اشارے سے سویرا کو اپنے قریب بلایا اور سرگوشیوں میں بولے تھے۔ "خدا کے بعد ان سب کو تیرے سہارے پر چھوڑے جارہا ہوں۔ تو ہی ان کا خیال رکھنا۔ تیرا بڑا بھائی توقیر طبیعت کا تھوڑا سا تیز ضرور ہے لیکن دل کا برا نہیں۔ اسے اب میری جگہ سمجھنا.........."

وہ سرگوشیوں میں کچھ اور بھی کہتے رہے تھے۔ سویرا کے بعد سب سے زیادہ پیار انہیں زلفی سے تھا۔ شاید زلفی کے بارے میں کچھ کہہ رہے تھے۔ انہیں یقین تھا کہ ننھا زلفی بڑا ذہین ہے۔ وہ پڑھائی میں بہت آگے تک جائے گا۔ شاید وہ ان آخری لمحوں میں سویرا سے درخواست کررہے تھے کہ وہ زلفی کو اسپتال کے اس وارڈ میں لے آئے تاکہ وہ اسے ایک نظر دیکھ سکیں۔ پھر ایک دم سویرا کی چیخیں نکل گئیں۔ اس نے اپنے پیارے ابو جان کی آنکھوں میں موت کی پرچھائیاں دیکھ لی تھیں۔ وہ چیخنے لگی۔ "ابو جان.......... ابو جان.......... نہیں ابو جان!" پھر وہ ڈاکٹروں کو آوازیں دینے لگی۔ ڈاکٹروں کو آوازیں دینے سے زندگی تو واپس نہیں آیا کرتی۔ اس کے ابو چلے گئے تھے۔

قدرت کے کام نرالے ہوتے ہیں۔ سویرا کی والدہ دو سال سے بیمار تھیں۔ کئی مواقع ایسے آئے تھے جب ان کی زندگی کا چراغ ٹمٹاتا نظر آیا تھا۔ مگر سویرا کے ابو نے اپنا سفر بہت بعد میں شروع کرکے بہت جلدی ختم کرلیا تھا۔ وہ صرف ڈیڑھ ماہ بیمار رہے تھے اور پھر عدم آباد کی طرف چل نکلے تھے۔ سویرا کی زندگی جو پہلے ہی ذمے داریوں اور غموں

کے بوجھ سے لدی پڑی تھی اب اور بھی زیربار ہو گئی تھی۔ والد کی وفات کے بعد فوراً بعد سویرا کا کالج چھوٹ گیا۔ اب وہ صرف گھر کی ہو کر رہ گئی تھی۔ سویرا کی عمر کی لڑکیاں زندگی کو بھرپور طریقے سے انجوائے کرتی ہیں' مرضی سے جاگنا' مرضی سے کھانا پینا' سہیلیوں کے جمگھٹے' سویرا کی زندگی میں ایسا کچھ نہیں تھا لیکن اس کے باوجود اس کے ماتھے پر کبھی شکن نہیں آئی تھی۔ اپنے اندر ان گنت پریشانیاں چھپا کر بھی وہ ہنستی مسکراتی تھی' ہر کسی کے ساتھ خندہ پیشانی سے پیش آتی تھی۔ ہاں کبھی کبھار ایسا ضرور ہوتا تھا کہ معاشی اور گھریلو سختیوں کی وجہ سے اس کی ہمت وقتی طور پر جواب دے جاتی تھی۔ ایسے میں وہ کمرا بند کر کے خوب روتی تھی اور رو رو کر ہلکی ہو جاتی تھی۔ ایسے ہی ایک واقعے نے اسے اس دن بہت رلایا۔ مہینے کے آخری دن تھے۔ سویرا کے پاس خرچے کے بس پندرہ روپے بچے تھے۔ اس نے آلو منگوا کر پکائے۔ سات افراد کے گھرانے کے لئے یہ سالن مشکل سے ہی پورا ہوتا تھا۔ سویرا نے کھانا نہیں کھایا اور اپنے حصے کا سالن خاموشی سے علیحدہ کر کے اور پلیٹ سے ڈھک کر الماری میں رکھ دیا۔ اس کا ارادہ تھا کہ کل اس سالن میں تھوڑا سا پانی ڈال کر شوربہ بنائے گی اور بچے چاولوں کے ساتھ کھا لیں گے' ماضی کی کئی راتوں کی طرح اس نے سرما کی یہ طویل رات بھوکے ہی کاٹ دی تھی۔ صبح ناشتے میں رس اور چائے تھی۔ جب سارے ناشتا کر چکے تو اس نے رسوں کا بچا کھچا چورا کھا کر گزارہ کر لیا۔ یہ چورا بھی اس نے کوئی پہلی بار نہیں کھایا تھا۔ بچپن سے یہ چورا ہی اس کے حصے میں آیا کرتا تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ پہلے وہ یہ چورا ابو کی نگاہ بچا کر کھایا کرتی تھی کیونکہ وہ ڈانٹتے تھے۔ اب تو وہ بھی نہیں تھے۔ اب وہ ہر قسم کا چورا کھانے کے لئے آزاد تھی اور یہ سب کچھ وہ بڑی خوشی سے کیا کرتی تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ اپنے ابو اور بھائیوں کو کھاتے دیکھ کر ہی اس کا پیٹ بھر جاتا تھا۔

سہ پہر تک سویرا کی بھوک عروج پر پہنچ چکی تھی۔ پنکی اکثر اس کے دل کی بات جان لیا کرتی تھی۔ بولی۔ ”کیا بات ہے آپی! آپ کا منہ سوکھا سوکھا ہے۔ طبیعت تو ٹھیک ہے؟“

”سوکھا سوکھا کہاں ہے؟“ سویرا نے مزاحیہ انداز میں منہ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

”سوکھا سوکھا اس لئے ہے جناب کہ مجھے شک ہے کہ آپ نے رات کو کھانا نہیں

کھایا۔“

”تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے! تمہارے سامنے بیٹھی تو کھا رہی تھی۔“

”سامنے بیٹھی نہیں کھا رہی تھیں۔ میرے سامنے آپ نے صرف دو لقمے لئے تھے۔ پھر روٹی پکڑ کر اندر چلی گئی تھیں۔“

”اچھا زیادہ تھانے دار مت بنو۔“ سویرا نے ذرا بے زاری سے کہا۔ ”میں نے کھایا تھا کھانا' تم جاؤ اوپر وہاں عدنان اور دانش دو گھنٹے سے جھگڑ رہے ہیں' انہیں چپ کراؤ۔ میرا دماغ پھٹنے لگا ہے۔“

پنکی' سویرا کو شک زدہ نظروں سے گھورتی ہوئے اوپر چلی گئی۔

☆=========☆=========☆

عدنان اور دانش کبھی کبھی بہت ہی تنگ کرتے تھے۔ خاص طور سے چھٹی والے دن تو سویرا کی جان مصیبت میں آئی رہتی تھی۔ جب کبھی ننھا زلفی بھی ساتھ شامل ہو جاتا تھا تو مختصر سے گھر میں بس طوفان ہی برپا ہو جاتا تھا۔ آج صبح سے کچھ اسی طرح کی سچویشن بنی ہوئی تھی۔ تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ عدنان اور دانش ”آپی' آپی!“ کی دہائی دیتے اور ایک دوسرے کے پیچھے دوڑتے سویرا کی طرف آئے۔ عدنان' دانش کو پکڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔ سویرا کے قریب سے ہو کر دانش کمرے میں گھس گیا۔ وہ عدنان کے پہنچنے سے پہلے الماری سے کوئی چیز نکالنا چاہ رہا تھا۔ اس نے جلدی سے الماری کھولی۔ سویرا نے سالن والی پلیٹ فرش پر گرنے اور ٹوٹنے کی آواز سنی۔ وہ اندر گئی تو دانش ڈرا سہما کھڑا تھا۔ سویرا کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اس نے بے اختیار دو تین تھپڑ دانش کے گالوں پر جڑ دیئے۔ ”اُلو کا پٹھا' خبیث' جنگلی!“ وہ بولتی چلی گئی۔ وہ خاموشی سے پٹ رہا تھا۔ پنکی نے آ کر اسے ایک طرف کیا۔ سویرا آنکھوں میں آنسو لئے کمرے میں آ گئی' دروازہ بند کر کے وہ خوب روئی۔ وہ سارا دن بھوکی رہی تھی تاکہ جیسے تیسے شام کا کھانا ہو جائے مگر عدنان اور دانش کی مستی نے سب کچھ تلپٹ کر دیا تھا۔

کچھ ہی دیر بعد دروازے پر مدھم دستک سنائی دی۔ دستک کئی بار دہرائی گئی مگر سویرا خاموش بیٹھی رہی۔ پھر پنکی کی ملتجیانہ آواز سنائی دی۔ ”آپی' دروازہ کھولیں.........

پلیز آپی!"

سویرا نے باتھ روم میں جاکر جلدی جلدی منہ دھویا اور تولئے سے پونچھتی ہوئی باہر آگئی۔ دیکھا تو چھ سالہ دانش ہاتھ میں ٹرے لئے کھڑا تھا۔ تندور کی گرم گرم روٹی تھی اور مرغ چنے کا سالن تھا۔ اس کے علاوہ کچھ آلو والے نان بھی تھے۔

"یہ کیا ہے؟" سویرا نے پوچھا۔

دانش خاموش رہا۔ سویرا نے پنکی کو مخاطب کیا۔ "یہ تم نے منگوایا ہے؟"

"نہیں آپی! قسم لے لو مجھ سے۔ مجھے تو کچھ معلوم نہیں۔ یہ خود ہی بازار گیا تھا۔"

"یہ جھوٹ بول رہی ہیں۔" عدنان نے کہا۔ "ان کا غلہ ادھر ٹوٹا ہوا پڑا ہے۔ اپنے غلے سے پیسے نکال کر انہوں نے یہ سب کچھ دانش سے منگوایا ہے۔"

پنکی سرجھکائے کھڑی تھی۔ سویرا نے جھڑک کر کہا۔ "تم نے کیوں توڑا غلہ؟"

وہ روہانسا ہو کر بولی۔ "مجھے علم ہے آپی! آپ نے کل سے کچھ نہیں کھایا۔ چلیں آپ ادھر بیٹھیں۔ سب سے پہلے کھانا کھائیں' پھربات کریں گے۔"

سویرا کی آنکھیں ایک بار پھر آنسو بہانے لگیں۔ اس نے بے اختیار پنکی کو گلے سے لگا لیا۔ پھر نیچے بیٹھ کر دانش کا منہ سر چومنے لگی۔ "مجھے معاف کردے منے بھائی! اللہ کرے میرے ہاتھ ٹوٹ جائیں۔ میں نے تجھے کیوں مارا۔"

والد کی وفات کے بعد اس گھر میں پنکی کو ہی کسی حد تک سویرا کا خیال ہوتا تھا۔ بچے تو خیر بچے ہی ہوتے ہیں۔ توقیر کا پارا ہر وقت چڑھا رہتا تھا۔ اس نے ایک جگہ چند دن سیلز مین کی نوکری کی تھی' اب وہ بھی چھوٹ گئی تھی۔ اس مصیبت نے اسے اور بھی چڑچڑا کر دیا تھا۔ والدہ کو توقیر سے زیادہ انس تھا۔ اسے پریشان دیکھ کر وہ مزید پریشان ہو جاتی تھیں۔ کسی وقت بیٹھے بٹھائے وہ سب کو کوسنے دینے لگتیں۔ "تم سب اس کی جان کو چمٹے ہوئے ہو۔ وہ کیا کرے' کہاں سے کما کرلائے تمہارے لئے۔ چھوٹی سی عمر میں اتنے بوجھ ہیں بے چارے پر......... بیمار ہو کر چارپائی سے لگ گیا تو پھر پتا چلے گا ساروں کو۔"

چھوٹی سی عمر میں سویرا پر بھی تو بڑے بوجھ تھے لیکن امی کو اس کا خیال کم کم ہی آتا تھا۔ شاید ممتا بھی بیٹے اور بیٹی میں تمیز کرتی ہے۔ یہ بات نہیں تھی کہ امی کو اس سے پیار

نہیں تھا مگر ان کا دھیان زیادہ بیٹوں کی طرف ہی رہتا تھا۔ بیٹوں کو کمانا تھا' گھر کو چلانا تھا۔ بڑھاپے کا سہارا بننا تھا۔ بیٹی تو پرایا دھن تھی۔ ایک دو برس کی مہمان تھی۔ اس مہمان کو رخصت کرنے میں بھی بیٹوں نے ہی ماں کا ہاتھ بٹانا تھا۔

ایک دن سہ پہر کے وقت سویرا صحن میں بیٹھی شلجم کاٹ رہی تھی کہ گلی میں احسن کی کھٹارا موٹر سائیکل کی آواز سنائی دی۔ سویرا کے چہرے پر شفق کی سرخی پھیل گئی اور اس نے احسن کے اندر آنے سے پہلے ہی سر پر آنچل درست کرلیا۔ چند سیکنڈ بعد بیرونی دروازہ کھلا اور احسن باآواز بلند السلام علیکم کہتا ہوا اندر آگیا۔

"وعلیکم السلام!" سب بچوں نے کورس کے انداز میں کہا۔ اس کورس میں سویرا کی مدھم آواز دب کر رہ گئی تھی۔

بچے احسن کو دیکھ کر اکثر خوش ہوتے تھے کیونکہ وہ ان کے ساتھ بڑی محبت سے پیش آتا تھا۔ وہ سب اس کے گرد گھیرا ڈال کر بیٹھ گئے۔ "خالہ کدھر ہیں؟" احسن نے پوچھا۔

"دوا لینے گئی ہیں۔" سویرا نے کہا۔

"اور وہ مسور کی دال۔" اس کا اشارہ پنکی کی طرف تھا۔

"وہ بھی ساتھ گئی ہے۔"

"یہ تو بڑی مبارک بات ہے۔"

"تمہارا مطلب ہے کہ امی کا ڈاکٹر کے پاس جانا مبارک بات ہے؟" سویرا نے آنکھیں نکال کر پوچھا۔

"بھئی میرا مطلب ہے کہ پنکی کا گھر سے نکلنا مبارک بات ہے۔ ورنہ وہ تو دماغ چاٹ جاتی ہے بندے کا۔ نان اسٹاپ باتیں کرتی ہے اور موضوع بھی وہی......... ٹی وی ڈرامے۔"

دانش اور زلفی ضد کرنے لگے۔ "احسن بھائی' پیسے دیں' چپس کھائیں گے۔"

احسن تو شاید کسی ایسے ہی موقع کا منتظر تھا۔ اس نے کن انکھیوں سے سویرا کو دیکھا اور جیب سے دس روپے نکال کر تینوں بچوں کو دے دیئے۔ "بھئی دو دو روپے تم تینوں

کے اور چار روپے ہمارے۔"

"ہمارے کس کے؟" عدنان نے پوچھا۔

"میرے اور سویرا کے۔ چار روپے کے چپس ہمارے لئے لے آنا اور سنو' نکڑ والی دکان سے نہ لانا اس کے آلو گلے سڑے ہوتے ہیں۔ جنرل اسٹور کے سامنے والے سے لانا۔"

وہ جان بوجھ کر بچوں کو تھوڑا سا دور بھیج رہا تھا تاکہ واپس آتے آتے انہیں وقت لگے۔ سویرا نے شوخی سے اسے دیکھا اور بولی۔ "تم تو کہتے تھے کہ تمہیں ڈرامے اچھے نہیں لگتے۔ اب خود ہی ہدایت کار اور اداکار بنے ہوئے ہو۔"

"بھئی' ایک تو میں تمہیں چپس کھلا رہا ہوں۔ اوپر سے تم مجھے ڈراما باز قرار دے رہی ہو۔ میرے خیال میں یہ اچھے اخلاق کی مثال نہیں۔"

"اچھا.........! میں نے اچھے اخلاق کی مثال قائم نہیں کی تو آپ ضرور کیجئے گا۔ میں کوئی الٹی سیدھی بات سننے کے موڈ میں نہیں ہوں۔"

بچے چلے گئے تو احسن نے اپنی کرسی سویرا کے قریب کھسکا لی اور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔ "میں ڈرپوک نہیں ہوں سویرا لیکن تم نے مجھے بنا دیا ہے۔ ہر وقت ایک ڈر کسی روگ کی طرح دماغ سے چمٹا رہتا ہے۔ کہیں ہم ایک دوسرے سے دور نہ ہو جائیں۔ کہیں ہمارے درمیان کوئی دیوار نہ کھڑی ہو جائے۔ خدا نہ کرے ایسا ہو گیا تو میں کیا کروں گا۔"

"وہی کرو گے جو سب کرتے ہیں۔ کوئی اور زندگی میں آجائے گا' راستے بدل جائیں گے' ساتھی بدل جائیں گے۔ پھر وقت کے ساتھ سب کچھ بدل جائے گا۔"

"تم بڑی پتھر دل ہو سویرا!"

"وہ کیوں؟"

"ایسی بات کہنے کے لئے پتھر کا دل چاہئے۔"

"تم کیا جانو' یہ دل کتنا نرم ہے۔ تم نے کبھی اس کے اندر نہیں جھانکا۔"

"تم نے کبھی جھانکنے ہی نہیں دیا۔ مجھے یوں لگتا ہے جیسے تمہارے ہاتھ میں ہر وقت

لمبائی ناپنے کا ایک پیمانہ ہوتا ہے۔ اس پیمانے سے تم دیکھتی رہتی ہو کہ کہیں میرے اور تمہارے درمیان فاصلہ کم تو نہیں ہو گیا۔"

"میں کیا کروں' میں کیا کر سکتی ہوں؟"

"تم باتوں باتوں میں امی کو یہ باور کرا سکتی ہو کہ تم میرے ساتھ......... میرا مطلب ہے......... میرے ساتھ شادی کرنا چاہتی ہو۔"

سویرا نے ایک دم شوخ نظروں سے احسن کو دیکھا اور بولی۔ "بھئی' مسئلہ یہ ہے کہ میں نے کبھی امی کے ساتھ جھوٹ نہیں بولا۔"

"اوئے سویرا کی بچی! میں تجھے......... قتل کر دوں گا' اس چھری کے ساتھ اور خود پیش ہو جاؤں گا تھانے میں۔" اس نے سویرا کا چھری والا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔

سویرا سرخ ہو گئی۔ اس نے بدکی ہوئی ہرنی کی طرح پڑوسیوں کی چھت کی طرف دیکھا۔ "خدا کے لئے احسن! چھوڑو میرا بازو' کوئی دیکھ لے گا۔"

"بازو اسی صورت میں چھوٹے گا' جب تم اپنے الفاظ واپس لو گی۔" اس نے سویرا کا دوسرا ہاتھ بھی پکڑ لیا۔

احسن کے لمس نے سویرا کے بدن میں جیسے برقی رو دوڑا دی تھی۔ وہ جلدی سے بولی۔ "ٹھیک ہے بابا' میں لیتی ہوں الفاظ واپس!"

"یہ تو کوئی بات نہیں' تم یہ کہو کہ تم......... میرے ساتھ......... شادی پر رضامند ہو اور باتوں باتوں میں تم یہ بات امی تک پہنچاؤ گی۔"

"اور اگر وہ نہ مانیں تو.........؟"

"مانیں گی کیوں نہیں؟"

"نہ ماننے کی ایک سو ایک وجوہات ہیں جن میں سے ایک یہ بھی ہے کہ آپ جناب کا ابھی تک دو لاکھ والا انعامی بانڈ نہیں نکلا ہے۔"

(احسن اکثر انعامی بانڈ کے چکر میں رہتا تھا)

"یعنی تمہاری امی تمہاری شادی کسی انسان سے نہیں' دو لاکھ کے انعامی بانڈ سے کرنا چاہتی ہیں۔" احسن جواب میں بولا۔

"میری امی ایسی نہیں ہیں اور نہ ہی میں ایسی ہوں۔" سویرا نے یکایک سنجیدگی اختیار کرتے ہوئے کہا۔ اس نے اپنے ہاتھ احسن کی گرفت میں ڈھیلے چھوڑ دیئے تھے۔ احسن کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولی۔ "احسن! تمہیں معلوم ہے میری زندگی کی دو سب سے بڑی خواہشیں کیا ہیں؟"

"کیا ہیں؟"

"اس گھر کی خوشی اور تمہارا ساتھ۔"

"آئی.......... لَو.......... یو سویرا!" احسن نے عجیب جذباتی لہجے میں کہا۔

اسی وقت گھر کا بیرونی دروازہ دھماکے سے کھلا اور بچے شور مچاتے ہوئے اندر آگئے۔ سویرا اور احسن جلدی سے الگ ہو کر بیٹھ گئے۔ ان کی محبت کا سرمایہ ایسی ہی چھوٹی چھوٹی ملاقاتیں تھیں.......... تھوڑی دیر بعد سویرا کی والدہ اور پنکی بھی آگئیں۔ ان کے آتے ہی احسن اور پنکی میں نوک جھونک شروع ہوگئی۔ یہ نوک جھونک ابھی جاری تھی کہ توقیر بھی گھر چلا آیا۔ آج اس کے سوکھے سوکھے چہرے پر امید کی ہلکی سی کرن نظر آرہی تھی۔ احسن سے واجبی بات چیت کر کے وہ امی کی طرف متوجہ ہوگیا۔ دونوں دیر تک سرگوشیوں میں باتیں کرتے رہے۔ پھر سویرا بھی ان باتوں میں شریک ہوگئی۔ توقیر نے بتایا کہ میونسپل کارپوریشن میں اسے کلرک کی نوکری مل رہی ہے۔ بڑا سنہری موقع ہے اور اس کے لئے ایک مناسب سفارش بھی اس نے ڈھونڈ لی ہے۔ جو سفارش توقیر نے ڈھونڈی تھی وہ سویرا کے لئے جانی پہچانی تھی۔ یہ ایل ایم سی کے ایک ٹاؤن آفیسر ثاقب صاحب تھے۔ ثاقب بشیر صاحب محکمے کی جانی پہچانی شخصیت تھے۔ عمر کوئی چالیس بیالیس سال رہی ہوگی۔ جسم فربہ تھا۔ رنگ قدرے سانولا' اکثر شلوار قمیض پہنتے تھے۔ کہا جاتا تھا کہ وہ خاصے رشوت خور قسم کے افسر ہیں۔ سویرا وغیرہ کے گھر سے ان کے گھر کا فاصلہ بس چند گز ہی تھا۔ دو ڈھائی سال پہلے سویرا کے مرحوم والد عطاء صاحب کو مکان کی رجسٹری اور نقشے کے سلسلے میں کارپوریشن نے تنگ کرنا شروع کیا تھا تو ثاقب صاحب سے ان کی سلام دعا ہوگئی تھی۔ غالب گمان تھا کہ محکمے سے ان کی جان چھڑانے کے سلسلے میں ثاقب صاحب نے سویرا کے ابو کی مدد کی تھی۔ ان دنوں وہ اکثر ان کے گھر بھی آتے

جاتے تھے۔ سویرا کو یہ شخص کبھی اچھا نہیں لگا۔ اسے دیکھتے ہی نہ جانے کیوں سویرا کے ذہن میں ایک گندے اور بدبودار شخص کا تصور ابھر آتا تھا۔ ایسا شخص جو مہینوں سے نہایا نہ ہو۔ جس کے بدن اور جس کی روح پر تہہ در تہہ میل چڑھی ہوئی ہو۔ اپنی بیوی سے اس شخص کی علیحدگی ہو چکی تھی اور اب طلاق ہونے والی تھی۔ دو بچے بیوی ہی کے پاس رہتے تھے۔ سویرا کو یہ جان کر افسوس ہوا کہ توقیر کو نوکری کے سلسلے میں اس شخص کی مدد درکار تھی۔

سویرا کے اندیشے کے عین مطابق اگلے دو چار روز میں ثاقب صاحب کے ساتھ اس کا سامنا ہوگیا۔ وہ اپنی روانی میں گھر کا کام کاج کرتی ہوئی تیزی سے گھر کی بیٹھک میں داخل ہوئی تھی۔ اسے ہرگز معلوم نہیں تھا کہ یہاں ثاقب صاحب توقیر کے ساتھ براجمان ہیں۔ وہ حسب عادت گولڈ لیف کا سگریٹ مٹھی میں دبا کر پی رہے تھے۔ چہرہ ہمیشہ سے زیادہ سانولا اور گندہ نظر آ رہا تھا۔ سردیوں کا موسم تھا اور اس موسم میں وہ اکثر ایک مفلر کانوں کے گرد لپیٹے رہتے تھے۔ سویرا کو دیکھ کر بولے۔ "او ہو بھئی! پچھلے پانچ چھ مہینے میں تو تم اور بھی لمبی ہوگئی ہو' کتنا لمبا ہونے کا ارادہ ہے؟"

"السلام علیکم انکل!" سویرا نے ٹھٹک کر کہا۔

وعلیکم السلام' وعلیکم السلام!" انہوں نے سگریٹ کا ایک طویل کش لیا۔

توقیر بولا۔ "سویرا! بڑی اچھی سی چائے بنا کر لاؤ اور ساتھ میں بسکٹ وغیرہ بھی ہو جائیں۔"

"ابھی نہیں۔" ثاقب نے بڑا سا سر ہلایا۔ "چائے پئیں گے بلکہ مٹھائی بھی کھائیں گے لیکن کام ہو جانے کے بعد۔"

"نہیں جناب!" توقیر خوشامدی لہجے میں بولا "کام اپنی جگہ چائے اپنی جگہ۔ اتنے دنوں بعد تو آپ تشریف لائے ہیں غریب خانے پر۔" اس کے ساتھ ہی اس نے سویرا کو اشارہ کیا کہ وہ جلدی سے چائے لے آئے۔

کمرے سے نکل کر سویرا کو جیسے سکون آگیا۔ سگریٹ کے دھوئیں سے اس کا دم گھٹنے لگا تھا اور بات صرف سگریٹ کے دھوئیں کی ہی نہیں تھی' اس نامانوس بو کی بھی تھی

جو ثاقب صاحب کے آس پاس چکراتی رہتی تھی۔ کم از کم سویرا کو تو یہی محسوس ہوتا تھا۔

اس نے چائے بنائی۔ بسکٹ اور نمکو وغیرہ بھی ساتھ رکھے لیکن خود بیٹھک میں جانے کی زحمت نہیں کی بلکہ عدنان کے ذریعے چائے کی ٹرے اندر بھجوا دی تھی۔

نوکری کے سلسلے میں توقیر کی بھاگ دوڑ جاری رہی اور اس کے ساتھ ثاقب بشیر کا آنا جانا بھی جاری رہا۔ سویرا ان کے سامنے آنے سے کتراتی تھی لیکن جب کبھی آمنا سامنا ہوتا تھا' اسے یوں لگتا تھا کہ ان کی تیز نگاہیں اس کے جسم کو چھید رہی ہیں۔

انہی دنوں توقیر کی نوکری لگ گئی۔ نوکری کے سلسلے میں ایک جگہ دو ہزار روپیہ نقد ادائیگی کی ضرورت تھی۔ اس دو ہزار کے سلسلے میں سویرا نے توقیر کو پریشان دیکھا تو بڑی خاموشی سے اپنی سونے کی بالیاں فروخت کردیں۔ یہ بالیاں والد صاحب نے سویرا کو اس وقت لے کر دی تھیں جب اس نے میٹرک کا امتحان امتیازی نمبروں سے پاس کیا تھا۔ یہ بالیاں سویرا کو بہت اچھی لگتی تھیں.......... مگر قربانی بھی تو اچھی چیز کی ہی دی جاتی ہے.......... اور سویرا قربانی کے عمل کا یہ لازمی تقاضا بہت پہلے سے جان چکی تھی۔

توقیر کی نوکری لگنے کے بعد گھر کی گرتی ہوئی معاشی حالت قدرے سنبھل گئی۔ امی کی دوائیں باقاعدگی سے آنے لگیں۔ بچوں کے کپڑے اور جوتے وغیرہ آئے۔ کچن چلانے میں سویرا کو جو زبردست دشواری پیش آرہی تھی وہ بھی کسی حد تک کم ہوگئی۔ وہ دن بھی کچھ اچھے ہی تھے۔ گلابی جاڑے کا موسم تھا اور یہ موسم بچپن سے ہی سویرا کو بہت بھاتا تھا۔ خاص طور سے سرما کی دھواں دھواں مختصر سی شامیں۔ ایسی شاموں میں وہ چھت پر چلی جاتی تھی۔ بستی کے در و دیوار پر دھوپ کے تیز رفتار سفر کو دیکھتی تھی اور پھر جب دن کا اجالا شام کی ٹھٹھرتی ہوئی تاریکی کی طرف بڑھتا۔ آسمان پر پتنگیں سرسراتیں' گلیوں میں بچے شور مچاتے' گھروں میں روشنیاں جلتیں اور چمنیوں سے دھواں نکلتا تو ایک عجیب سا سحر اس پر طاری ہو جاتا۔ اس کا نام تو سویرا تھا لیکن نہ جانے کیوں اسے شام پسند تھی اور وہ بھی سردیوں کی شام۔ ایسی شاموں میں وہ احسن کو کثرت سے یاد کرتی۔ اس کا تصور اس کی نگاہوں میں بس جاتا۔ وہ سوچتی' وہ بھی تو اسی بستی کے ایک سرے پر رہتا ہے۔ وہ کیا کررہا ہوگا؟ کیا سوچ رہا ہوگا؟ کسی دلگداز نغمے کی طرح احسن کا خیال اس کی رگ جاں

میں بس جاتا۔ وہ سوچتی.......... وہ دونوں ایک ہی شام' ایک ہی فضا اور ایک ہی بستی میں سانس لے رہے ہیں لیکن ایک دوسرے سے کتنا دور ہیں۔ وقت تیزی سے گزرتا چلا جا رہا ہے اور اس کے ساتھ ہی محبت کی مہلت بھی محو پرواز ہے۔ کسے خبر' جب آئندہ سرما میں ایسی ہی شامیں لوٹ کر آئیں' وہ دونوں کہاں ہوں؟

توقیر بھائی ان دنوں بہت دیر سے گھر آرہے تھے۔ دفتر سے فارغ ہو کر وہ سیدھا ماڈل ٹاؤن چلے جاتے تھے۔ جہاں ثاقب بشیر نے تین کنال پر واقع ایک پرانی کوٹھی خریدی تھی۔ اسے گرا کر وہ کنال کنال کی تین کوٹھیاں بنوا رہے تھے۔ دو کوٹھیاں کرائے کے لئے اور ایک اپنی رہائش کے لئے۔ ظاہر ہے کہ ایک ٹاؤن آفیسر یہ سب کچھ حلال کی کمائی سے تو نہیں کرسکتا تھا۔

ایک رات توقیر دیر تک واپس نہیں آیا۔ سویرا نے یہی سمجھا کہ وہ ماڈل ٹاؤن میں سائٹ پر رک گیا ہوگا لیکن جب گھڑی کی سوئیاں رات کے دس بجانے لگیں تو سویرا کی پریشانی عروج پر پہنچ گئی۔ والدہ اور بچوں کو کھانا وغیرہ کھلا کر اس نے عدنان کو ساتھ لیا اور ثاقب صاحب کے گھر پہنچ گئی۔ ثاقب صاحب کا ویسپا اسکوٹر گھر میں تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ بھی گھر میں ہیں۔ وہ اپنے چھوٹے بھائی عارف بشیر اور اس کے بیوی بچوں کے ساتھ رہائش پذیر تھے۔ ثاقب صاحب نے توقیر کے بارے میں لاعلمی کا اظہار کیا۔ پھر سویرا اور عدنان کے سامنے ہی انہوں نے ماڈل ٹاؤن سائٹ پر فون کیا۔ سائٹ پر بھی چوکیدار کے سوا اور کوئی نہیں تھا' سویرا گھر واپس آگئی۔

ساڑھے گیارہ بجے کے لگ بھگ دروازے پر دستک ہوئی۔ دھڑکتے دل کے ساتھ سویرا نے دروازہ کھولا۔ توقیر کا ایک دوست رندھاوا موجود تھا۔ اس نے ہراساں لہجے میں بتایا کہ توقیر تھانے میں ہے۔

"کیوں تھانے میں ہیں؟ کیا' کیا ہے انہوں نے؟" سویرا نے چیخ کر پوچھا۔

"گھبرانے کی بات نہیں باجی..........! دراصل انہیں پوچھ گچھ کے لئے تھانے لے جایا گیا ہے۔"

"کس بات کی پوچھ گچھ۔ یہی تو پوچھ رہی ہوں کہ انہوں نے کیا' کیا ہے؟"

"اصل میں ان کے دوست احسان کی موٹر سائیکل کا نمبر ایف آئی آر میں درج ہوا ہے۔ کل دوپہر فیروز پور روڈ پر ایک ڈکیتی ہوئی تھی۔ موٹر سائیکل سوار دو لڑکوں نے ایک جیولری شاپ سے دس لاکھ روپے لوٹے تھے۔ اس واردات میں ایک بندہ مارا بھی گیا ہے۔ ڈاکو موٹر سائیکل پر فرار ہو رہے تھے کہ ایک راہ گیر نے نمبر نوٹ کرلیا۔ پولیس اسی نمبر کو ٹریس کر کے احسان تک پہنچی۔ آج کل احسان اور توقیر اکٹھے ہی گھومتے پھرتے ہیں۔ اس لئے احسان کے ساتھ توقیر کو بھی پولیس والے لے گئے ہیں۔"

"اوہ خدایا، اب کیا ہوگا؟" سویرا نے سر تھام لیا۔

وہ توقیر کے دوست احسان کو جانتی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ وہ ایسا لڑکا نہیں ہے، نہ ہی وہ اپنے بھائی کے بارے میں اس قسم کی کوئی بات سوچ سکتی تھی۔ اس کا دل گواہی دے رہا تھا کہ جو کچھ ہوا ہے، غلط فہمی کی بنیاد پر ہوا ہے۔

سویرا نے والدہ کو اصل بات سے بے خبر رکھا اور بتایا کہ توقیر نے پیغام بھیجا ہے۔ وہ ضروری کام کے سلسلے میں احسان کے گھر رک گیا ہے، صبح آئے گا۔

بعد ازاں اس نے چپکے سے عدنان کو ساتھ لیا اور ثاقب بشیر کے گھر پہنچ گئی۔ اس نے روہانسی آواز میں ثاقب صاحب کو ساری صورت حال سے آگاہ کیا۔ ثاقب صاحب نے اسی وقت لباس تبدیل کیا۔ کانوں کے گرد مفلر لپیٹا اور اپنا اسکوٹر پکڑ کر نکل گئے.......... ان کی واپسی صبح سے کچھ دیر پہلے ہی ہوئی تھی۔ ان کا چہرہ بتا رہا تھا کہ معاملہ گمبھیر ہے۔

"کیا بات ہے.......... آپ.......... توقیر بھائی کو ساتھ نہیں لائے؟"

ثاقب صاحب نے اس کا شانہ تھپکتے ہوئے کہا۔ "حوصلہ رکھو.......... سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

"مگر کب آئیں گے وہ؟"

"بھئی! مصیبت آ تو فوراً جاتی ہے لیکن جاتے جاتے کچھ دیر لگتی ہے۔ ایک دو روز میں وہ آجائے گا۔"

ایک دو روز کا سن کر سویرا کا دل ڈوب گیا تھا۔ بھائیوں میں اس کی جان تھی۔ کبھی

کبھی تو اسے یوں لگتا تھا جیسے وہ ان کی بہن ہی نہیں ماں بھی ہے اور شاید باپ بھی۔ جیسے مرغی چوزوں کو پروں کے نیچے چھپا چھپا کر رکھتی ہے۔ وہ اپنے بہن بھائیوں کو ایسے ہی رکھنا چاہتی تھی۔ اس نے گلوگیر آواز میں ثاقب صاحب سے کہا۔ "پلیز! کچھ کریں، خدا کے بعد ہمیں آپ ہی کا آسرا ہے۔" سویرا کی والدہ بھی ڈگمگاتی ہوئی وہاں پہنچ گئی تھیں۔ انہیں اب ساری صورت حال معلوم ہوچکی تھی۔ وہ بھی ثاقب کی منت سماجت کرنے لگیں۔

ثاقب صاحب نے بتایا۔ "موٹر سائیکل کا نمبر وہی نوٹ ہوا ہے جو احسان کی موٹر سائیکل کا ہے۔ رنگ اور ماڈل وغیرہ بھی وہی ہے۔ جس جیولر کو لوٹا گیا تھا، آج وہ تھانے میں آکر موٹر سائیکل اور لڑکوں کو شناخت کرے گا۔ اب سب کچھ اس کے بیان پر ہے۔ اگر اس نے کوئی الٹا سیدھا بیان دے دیا تو مشکل ہو جائے گی۔"

سویرا نے روتے ہوئے کہا۔ "آپ جانتے ہیں ثاقب انکل! توقیر ایسے نہیں ہیں۔ میں قسم کھا سکتی ہوں کہ ان کا اس معاملے سے کوئی دور کا واسطہ بھی نہیں ہوگا۔ آپ مجھے تھانے لے جائیں۔ میں خود بات کروں گی پولیس والوں سے۔"

ثاقب صاحب نے ایک بار پھر سویرا کا شانہ تھپکا۔ "بھئی، ہمارے ہوتے تم تھانے کیوں جاؤ گی؟ تم بالکل حوصلہ رکھو۔ میں سب ٹھیک کرلوں گا۔"

سویرا کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گر رہے تھے۔ ثاقب صاحب نے بڑی متانت سے اس کے آنسو پونچھے۔ ان کی موٹی بھدی انگلیوں کا لمس سویرا نے اپنے نازک رخساروں پر محسوس کیا۔ اس کے ساتھ ہی وہی ناپسندیدہ بو اس کے نتھنوں سے ٹکرائی جو اس کے حواس مختل کردیا کرتی تھی لیکن آج یہ بُو اسے کسی دور کی بازگشت کی طرح لگ رہی تھی۔ وہ ان لمحوں میں بھی یہ سوچے بغیر نہ رہ سکی کہ حالات کے تحت انسانی احساسات میں کتنی حیرت انگیز تبدیلی رونما ہوتی ہے۔

دوپہر تک کا وقت سویرا نے رو رو کر اور دعائیں مانگ مانگ کر ہی کاٹا تھا۔ باقی کا سارا گھر بھی سہا ہوا تھا۔ ثاقب صاحب نے دو ڈھائی بجے آنے کا کہا تھا۔ وہ تو نہیں آئے مگر احسن چلا آیا۔ وہ بھی تھانے سے ہی آیا تھا اور سویرا کے لئے ثاقب صاحب کا پیغام لایا

تھا۔ اس کے چہرے کی افسردگی دیکھ کر ہی سویرا کا دل بیٹھ گیا۔ احسن نے کہا۔ "ابھی توقیر گھر نہیں آسکے گا۔"

"کیوں نہیں آسکیں گے۔ کس جرم میں انہوں نے پکڑا ہے انہیں؟"

"ابھی ایک گھنٹہ پہلے جیولر تھانے آیا تھا۔ وہ راہ گیر بھی تھا جس نے موٹر سائیکل کا نمبر نوٹ کیا تھا۔ وہ دونوں یقین سے کہتے ہیں کہ موٹر سائیکل کا نمبر یہی تھا۔"

"مگر ڈاکے مارنے والے اصل نمبروں سے تو وارداتیں نہیں کرتے۔"

"یہ بات تو سب ہی جانتے ہیں۔ مگر پولیس اپنے طریقے سے کارروائی کرتی ہے۔ جیولر نے احسان اور توقیر کو شناخت تو نہیں کیا مگر اس کا اتنا کہہ دینا ہی کافی ہے کہ لڑکے ان جیسے تھے۔ خاص طور سے اس نے توقیر کے بارے میں کہا ہے کہ ایک لڑکے کا قد کاٹھ اور بال وغیرہ توقیر جیسے تھے۔"

"اب کیا ہوگا احسن؟" سویرا نے لرزتے ہاتھوں سے احسن کا بازو تھام لیا۔

"بس..........بس دعا کرو اور تو کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔"

"ثاقب انکل تو کہتے تھے کہ.........."

"ثاقب انکل آئی جی پولیس تو نہیں ہیں۔" احسن نے بیزاری سے اس کی بات کاٹی۔ "وہ بھی کوشش ہی کرسکتے ہیں۔"

"وہ..........لوگ توقیر بھائی کو ماریں پیٹیں گے تو نہیں؟"

"اس بارے میں کیا کہا جاسکتا ہے۔ ثاقب صاحب نے تفتیشی افسر کو پیسے ویسے تو دیئے ہیں مگر بات ایس پی کی ہے' وہ اس کیس کی خود نگرانی کررہا ہے۔ جیولر شیخ شوکت سے ایس پی کے قریبی تعلقات ہیں۔ ویسے یہ کوئی معمولی واردات نہیں ہے' ایک بندے کی جان گئی ہے۔"

سویرا اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر وہیں بیٹھ گئی تھی۔ اس کی امی بھی رونے لگی تھیں۔ بہن بھائی مرجھائے چہروں اور سہمی نظروں کے ساتھ سویرا کی طرف دیکھ رہے تھے۔ پنکی نے احسن کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "احسن بھائی' ایک اخبار والا آپ کا دوست تھا۔ اس سے بات کرکے دیکھیں۔"

احسن بولا۔ "ایسی مصیبت میں کوئی کم ہی ساتھ دیتا ہے۔ بہرحال میں کوشش کرکے دیکھتا ہوں۔"

وہ لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے باہر چلا گیا تھا۔

آئندہ روز سویرا اپنی والدہ کو لے کر پولیس اسٹیشن پہنچ گئی تھی۔ انہوں نے حوالات میں توقیر سے ملاقات کی۔ توقیر کی حالت دیکھ کر سویرا کا کلیجہ کٹ گیا تھا۔ اسے بری طرح مارا پیٹا گیا تھا۔ بے چارے سے چلنا مشکل ہو رہا تھا۔ اس نے ماں اور بہن کو دیکھ کر آنکھوں میں آنسو بھر لئے۔ وہ کراہتے ہوئے بولا تھا۔ "میں نے کچھ نہیں کیا سویرا۔ خدا کی قسم میں بالکل بے گناہ ہوں۔ ثاقب صاحب سے کہو' مجھے کسی طرح یہاں سے نکال لیں۔ یہ لوگ مجھے مار ڈالیں گے۔"

سویرا اور اس کی والدہ نے ایس ایچ او کی منت سماجت کی تھی' وہ بولا تھا۔ "مدعی پارٹی بڑی زور والی ہے۔ یہ بات تو ہم بھی جانتے ہیں کہ ان لڑکوں نے یہ کارروائی نہیں کی ہے مگر ان کی موٹر سائیکل تو استعمال ہوئی ہے اور اگر فرض کرلیا جائے کہ کسی نے فرضی نمبر پلیٹ لگا کر واردات کی ہے تو پھر بھی یہ نمبر تو استعمال ہوا ہے۔ ممکن ہے کہ یہ ان کے کسی یار دوست کا کام ہو۔ ہم اس بارے میں پوچھ گچھ کررہے ہیں۔"

سویرا بولی۔ "آپ نے مار مار کر میرے بھائی کا حشر کردیا ہے اور آپ کہہ رہے ہیں کہ آپ پوچھ گچھ کررہے ہیں۔"

"جو ہوگیا وہ ہوگیا بی بی! اب پچھلے چوبیس گھنٹے سے ہم نے ان دونوں کو انگلی بھی نہیں لگائی ہے۔ آپ بے فکر ہو جائیں۔ ایس پی صاحب بڑے نیک طبیعت کے بندے ہیں۔ اگر آپ کا بھائی بے گناہ ہے تو اس کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں ہوگی۔"

شام کو ثاقب صاحب گھر آگئے تھے۔ وہ اس بات پر سویرا اور اس کی امی سے سخت خفا تھے کہ وہ تھانے گئی تھیں۔ انہوں نے سینے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا تھا۔ "میرے ہوتے ہوئے آپ دونوں کو کیا ضرورت تھی وہاں جانے کی؟ کیا آپ مجھ کو اپنا نہیں سمجھتی ہیں یا آپ کو بھروسا نہیں مجھ پر؟"

سویرا کی والدہ روہانسا ہو کر بولی تھیں۔ "بھائی صاحب' آپ کے سوا ہمارا اور کون

ہے؟ آپ پر بھروسا نہیں کریں گے تو کس پر کریں گے؟"

سویرا نے ثاقب صاحب کو چائے بنا کر پلائی تھی۔ عدنان بازار سے سموسے اور بسکٹ وغیرہ لے آیا تھا۔

تیسرے چوتھے روز ثاقب صاحب بھاگ دوڑ کر کے توقیر کو تھانے سے چھڑا لائے لیکن اس کی حالت خراب تھی۔ پولیس والوں نے اس کے ساتھ خاصی مار پیٹ کی تھی۔ اس کی ریڑھ کی ہڈی پر چوٹیں آئی تھیں جن کے سبب اس سے چلا نہیں جا رہا تھا۔ اسے تیز بخار بھی تھا۔ ثاقب صاحب نے علاج معالجے کے لئے اسے شیخ زید اسپتال میں داخل کرا دیا تھا۔ پانچ چھ روز میں توقیر کے علاج پر چار پانچ ہزار روپیہ اٹھ گیا۔ یہ خرچ ثاقب صاحب اپنے پاس سے ہی کر رہے تھے۔ سویرا کی والدہ کے پاس کل جمع پونجی کے طور پر سونے کی دو پتلی پتلی چوڑیاں تھیں۔ انہوں نے چوڑیاں بیچنے کی کوشش کی مگر ثاقب صاحب نے سختی سے منع کر دیا۔ پانچ چھ دن کے علاج اور آرام کے بعد توقیر کی حالت سنبھل گئی۔ تاہم ابھی کچھ دن مزید اسے اسپتال میں ہی رہنا تھا۔ اس کی ہڈی کی اسکیننگ وغیرہ ہونی تھی۔

اس سارے معاملے کے دوران میں ثاقب صاحب کثرت سے توقیر کے گھر آتے جاتے رہے۔ انہوں نے سویرا سے کوئی ایسی ویسی بات نہیں کہی تھی، نہ ہی ان کے برتاؤ کو اخلاق کے منافی کہا جا سکتا تھا۔ پھر بھی سویرا نے ان کی نظروں کو اکثر اپنے سراپے پر دو دہکی ہوئی سلاخوں کی طرح محسوس کیا تھا۔ عورت کی حساسیت ایسے معاملوں میں ویسے بھی مسلمہ ہوتی ہے۔ سویرا محسوس کرتی تھی کہ ثاقب کی نگاہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے ان کی اپنی نگاہ نہیں رہتی۔ ان کے اندر کے میلے کچیلے شخص کی نگاہ بن جاتی ہے۔ ایک روز جب سویرا کی والدہ اور پنکی توقیر کو کھانا دینے اسپتال گئی ہوئی تھیں، ثاقب صاحب آ گئے۔ سویرا اس وقت سب سے چھوٹے بھائی زلفی کو نہلانے میں مصروف تھی۔ وہ ننگ دھڑنگ کھڑا تھا اور سویرا کے ہاتھ صابن میں لتھڑے ہوئے تھے۔ ثاقب صاحب کو دیکھ کر سویرا نے جلدی سے سر پر دوپٹا درست کیا اور ہاتھ دھو لئے۔ وہ برآمدے سے کرسی گھسیٹ کر صحن میں لے آئی تاکہ ثاقب صاحب بیٹھ سکیں۔ اپنی اوڑھنی کے پلو سے وہ

کرسی جھاڑتے ہوئے بولی۔ "انکل! آپ تو کہتے تھے کہ ہفتے کے دن آپ ماڈل ٹاؤن والے مکان میں شفٹ ہو جائیں گے۔"

ثاقب صاحب نے گہری سانس لی اور کرسی پر ڈھیر ہوتے ہوئے بولے۔ "تمہارے فقرے میں دو باتیں غلط ہیں۔"

"میں سمجھی نہیں؟"

"پہلی بات تو یہ کہ میں نے یہ نہیں کہا تھا کہ ہفتے کے روز جاؤں گا بلکہ کہا تھا کہ ہفتے تک جاؤں گا۔ اور ہفتہ پورا ہونے میں ابھی چار روز باقی ہیں۔"

"اوہ سوری!" سویرا نے کہا "اور دوسری بات............؟"

"یہ دوسری بات یہ کہ میں نے پہلے بھی کہا تھا کہ مجھے انکل مت کہا کرو۔ تم انکل کہتی ہو تو مجھے لگتا ہے کہ جیسے میں ایک دم اپنی عمر سے چالیس سال آگے چلا گیا ہوں اور میرے پاؤں قبر میں لٹک گئے ہیں۔"

سویرا کے چہرے پر شرم کی سرخی پھیل گئی۔ اس نے کچھ کہنا چاہا لیکن اس سے پہلے ہی ثاقب صاحب نے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک چھوٹی سی ڈبیا نکال لی۔ اس ڈبیا میں دو خوبصورت طلائی بالیاں تھیں۔

"ارے، یہ کیا ہے؟" سویرا حیرت سے بولی۔

ثاقب صاحب نے اپنی ٹھوڑی کھجاتے ہوئے کہا۔ "مجھے علم ہے، جب توقیر کی نوکری لگی تھی تو تمہیں دو ہزار کے لئے اپنی بالیاں بیچنا پڑی تھیں۔ جب بھی تمہارے خالی کانوں کو دیکھا ہے، یہی سوچا ہے کہ ان کو خالی نہیں ہونا چاہئے، یہ رکھ لو۔"

"کک............ کیسے رکھ لوں؟ آپ بھی عجیب بات کرتے ہیں۔" سویرا ذرا تیزی سے بولی۔

"بھئی رکھ لو۔" انہوں نے باقاعدہ سویرا کا ہاتھ پکڑ کر ڈبیا ہاتھ میں دے دی۔ سویرا کو یوں لگا جیسے اس شخص نے ہاتھ پر انگارا رکھ دیا ہے۔ اس نے جلدی سے ڈبیا نیچے رکھ دی۔

"نن............ نہیں انکل! میں یہ نہیں لے سکتی۔ پپ............ پلیز! آپ ایسی باتیں

مت کیا کریں۔"

"بھئی! میں محبت سے لایا ہوں۔ تحفے کو اس طرح ٹھکرایا نہیں کرتے۔ برا شگون ہوتا ہے۔"

"پلیز انکل! میرے دل میں آپ کی بڑی عزت ہے۔ آپ مجھے اس طرح مجبور نہ کریں۔"

ایک دم ثاقب صاحب کے سانولے چہرے پر رنگ سا گزر گیا۔ وہ سویرا کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولے۔ "پھر وہی انکل! لگتا ہے کہ تم نے اس لفظ کو میری چڑ بنا لیا ہے۔"

"میں آپ سے کسی گستاخی کا سوچ بھی نہیں سکتی لیکن آپ بھی.........." آواز اس کے گلے میں پھنس گئی اور آنکھوں میں آنسو امڈ آئے۔

ثاقب صاحب کا ضبط جیسے جواب دے گیا تھا۔ ایک دم اٹھتے ہوئے بولے۔ "میں نے کیا کردیا ہے۔ کون سا ظلم کا پہاڑ توڑ دیا ہے تم لوگوں پر؟ اگر ایسا کچھ ہوا ہے تو بھئی' میں معافی چاہتا ہوں اپنے کئے کی.......... بڑا شرم سار ہوں تم لوگوں سے۔" ان کے لہجے میں زہریلی پھنکار تھی۔

"آپ کو ایسا نہیں کہنا چاہئے۔ آپ جانتے ہیں' ہم سب آپ کی بہت عزت کرتے ہیں۔"

"عزت.......... عزت.......... عزت!" وہ ایک دم بھڑک کر بولے۔ "مجھے نہیں چاہئے ایسی عزت اور میں جانتا ہوں جو عزت تم لوگ کرتے ہو۔ اپنے اس چھوٹے بھائی سے پوچھو۔ اس نے مجھے ایک دن بتایا تھا کہ تمہارے دل میں میری کتنی عزت ہے۔" وہ بدستور زہریلے لہجے میں بولے۔

"میں سمجھی نہیں' آپ کیا کہہ رہے ہیں؟"

"میں تمہارے بھائی عدنان کی بات کررہا ہوں۔"

"کیا کہہ دیا تھا اس نے آپ سے؟"

"یہ امی سے پوچھنا تو بہتر رہے گا۔" انہوں نے کہا پھر ڈبیا اٹھائی اور پاؤں پٹختے

ہوئے دروازے کی طرف بڑھے۔

سویرا لڑکھڑا کر کھڑی ہوگئی۔ "پلیز' رک جائیے۔ اس طرح نہ جائیے۔ امی کیا کہیں گی؟"

وہ سنی ان سنی کرتے ہوئے باہر نکل گئے۔

سویرا کتنی ہی دیر گم صم بیٹھی رہی۔ اس کی نازک ہتھیلیوں پر پسینہ آگیا تھا۔ پھر جیسے وہ ایک دم چونک کر عدنان کی طرف مڑی۔ اس کا بازو تھاما اور جھنجوڑ کر بولی۔

"عدنان! تم نے کیا کہہ دیا تھا ثاقب صاحب سے؟"

اس کی آنکھوں سے خاموش گھبراہٹ جھلکنے لگی۔ سویرا نے ایک بار پھر جھنجوڑ کر پوچھا۔ "بتا کیا کہہ دیا تھا؟"

عدنان تو خاموش رہا۔ دانش معصومیت سے بولا۔ "آپی' انہوں نے ثاقب انکل سے کہا تھا.......... انہوں نے کہا تھا.........."

"کیا کہا تھا؟"

"انہوں نے کہا تھا.......... آپی کہتی ہیں' آپ سے بدبو آتی ہے۔"

سویرا سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔ عدنان کو کھینچ کر بولی۔ "اوئے خبیث! میں نے کب کہا تھا؟ تیرے سامنے تو میں نے ایسی بات کبھی نہیں کی۔"

دانش نے وضاحت کی۔ "آپ نے اس کے سامنے نہیں کہا تھا' آپ پنکی آپی سے بات کررہی تھیں' اس نے سن لیا تھا۔"

"اوہ مائی گاڈ!" سویرا نے اپنا سر گھٹنوں میں دے لیا اور آنسو بہانے لگی۔ اس کا سارا بدن خزاں رسیدہ پتے کی طرح لرز رہا تھا۔ ایک بار تو اس کے دل میں آئی کہ وہ امی کے آنے سے پہلے عدنان کے ساتھ ثاقب صاحب کے گھر جائے اور ان سے معذرت کرلے۔ مگر پھر اس کی ہمت نہیں ہوئی۔ اس دوران میں امی اور پنکی بھی آگئیں۔ سب کے اترے ہوئے چہرے دیکھ کر ان کا ماتھا ٹھنکا.......... امی کے پوچھنے پر سویرا نے انہیں سبھی کچھ بتا دیا۔ امی بھی ایک دم گم صم ہوگئیں۔ یہ مرے کو مارے شاہ مدار والی بات تھی۔ وقت ان کے زخموں کا علاج انگاروں سے کررہا تھا۔

تینوں ماں بیٹی نے ڈری سہمی روحوں کی طرح تین چار دن گزار دیئے۔ سویرا کی جان سب سے زیادہ آفت میں تھی۔ پھر وہی ہوا جس کا اندیشہ تھا۔ ایک دن ثاقب صاحب کا ملازم ریاض آیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک کاغذ تھا۔ اس پر ثاقب صاحب نے لکھا تھا۔

”توقیر کو تھانے سے چھڑانے کے لئے میں نے جو کچھ کیا وہ میرا اخلاقی فرض تھا۔ اس چکر میں میرے کئی دن صرف ہوئے اور تین چار ہزار روپیہ خرچہ بھی آیا۔ بہرحال اس سلسلے میں' میں آپ سے کوئی مطالبہ نہیں کررہا ہوں۔ آپ صرف وہ رقم عنایت فرمادیں جو اسپتال میں توقیر کے علاج معالجے پر اٹھی ہے۔“

اس سے نیچے اخراجات کی فہرست تھی اور رسیدیں تھیں۔ میزان دیکھ کر سویرا کا دل دھک سے رہ گیا۔ دوائیں' کمرے کا کرایہ' کھانے کا بل اور مختلف ٹسٹوں وغیرہ کی فیس ملا کر یہ تقریباً تیرہ ہزار روپیہ بنتا تھا۔

سویرا کا زرد رنگ دیکھ کر امی نے پوچھا کہ کیا بات ہے؟

سویرا بولی۔ ”امی! ثاقب صاحب نے تیرہ ہزار روپے طلب کئے ہیں۔“

”ہم کہاں سے دیں گے اتنے روپے؟“ سویرا کی امی نے خوف زدہ ہو کر کہا۔ ”ہم نے جاکر ثاقب سے کہا تو نہیں تھا کہ وہ توقیر کو مہنگے اسپتال میں داخل کرائے۔ ہماری جتنی چادر تھی' ہم نے اتنے ہی پاؤں پھیلائے تھے۔ ہم میو اسپتال میں داخل کرا دیتے اسے۔“

پنکی نے افسردگی سے کہا۔ ”ابو کی بیماری میں آپ نے سرکاری اسپتال کا حال دیکھ ہی لیا تھا۔ دو دو دن ڈاکٹر پوچھنے نہیں آتا تھا۔“

اس دوران میں احسن کی موٹر سائیکل کی آواز سنائی دی۔ سب خاموش ہوگئے۔ چند لمحے بعد احسن دروازہ کھول کر اندر آگیا۔ وہ خوش نظر آرہا تھا۔ پہلے تو سویرا نے یہ سمجھا کہ شاید اس کا کوئی چھوٹا موٹا بانڈ نکل آیا ہے۔ تاہم تھوڑی دیر بعد احسن نے بتایا کہ اسے ایک مناسب سا کام مل گیا ہے۔ وہ پڑھائی جاری رکھے گا اور پارٹ ٹائم کے طور پر ایک سرامکس کمپنی کی مصنوعات مقامی مارکیٹ میں متعارف کرائے گا۔ احسن نے بتایا کہ کبھی نہ کبھی کھوٹا سکہ بھی چل جاتا ہے۔ آج اس کی کھٹارا موٹر سائیکل بھی ایک کام کی چیز بن گئی ہے۔

اپنی خوشخبری سنانے کے تھوڑی ہی دیر بعد احسن نے محسوس کرلیا کہ دال میں کچھ کالا ہے۔ گھر کا بوجھل ماحول اس سے چھپا نہیں رہ سکا تھا۔ اس نے استفسار کیا تو سویرا کی امی سے چپ نہیں رہا گیا۔ سویرا کے اشاروں کے باوجود انہوں نے احسن کو سب کچھ بتا دیا.......... اس اطلاع نے احسن کو بھی پریشان کردیا۔ وہ اس گھر کے مشکل حالات کے بارے میں کچھ جانتا تھا اور کچھ نہیں جانتا تھا لیکن اب اسے سبھی کچھ معلوم ہوگیا تھا۔ ثاقب صاحب اس کے لئے کبھی بھی پسندیدہ شخصیت نہیں تھے۔ اب ان کا اصل روپ کھل کر سامنے آگیا تھا۔ سویرا نے دیکھا' احسن کی پیشانی پر ایک موٹی رگ ابھر آئی تھی۔ یہ رگ اس کے اندر کی ہیجانی کیفیت اور تمازت کی غمازی کرتی تھی۔ وہ سویرا سے مخاطب ہو کر شکوہ کناں لہجے میں بولا۔ ”میں نے تم سے کہا تھا نا.......... یہ شخص اندر سے کچھ اور ہے۔ یہ لوگ دینے والے نہیں' لینے والے ہوتے ہیں۔ کسی پر احسان کرتے ہیں تو اس کا بدلہ سو سے ضرب دے کر لینا چاہتے ہیں۔ مجھے تو یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ..........“ کچھ کہتے کہتے احسن ایک دم خاموش ہوگیا۔ پھر ذرا توقف سے بولا ”.......... کہ خالو جان کی زندگی میں اس مکان کی تعمیر کے خلاف کارپوریشن نے جو نوٹس جاری کیا تھا' وہ بھی اس شخص نے جاری کرایا تھا۔ بعد میں خود ہی اس مسئلے کو حل بھی کراتا رہا تھا۔“

سویرا کی والدہ گلوگیر لہجے میں بولیں۔ ”بتا بیٹا! ہم کیا کریں۔ اب تو یوں لگتا ہے کہ سانس لینا بھی مشکل ہو جائے گا۔“

”آپ حوصلہ رکھیں خالہ! اللہ مدد کرنے والا ہے۔ انشاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ احسن نے تسلی دینے کی کوشش کی تھی۔

تیسرے چوتھے روز کی بات ہے۔ شام ہی کا وقت تھا۔ شام جو ہمیشہ سویرا کو احساس اور خیال کی نئی دنیا میں لے جاتی تھی۔ وہ چھت پر بیٹھی تھی اور اپنی محبوب بستی کو دیکھ رہی تھی۔ اس بستی کی بے ترتیبی' اس کا ٹیڑھا پن' اس کا شور یہ سب کچھ اپنی جگہ حقیقت تھا لیکن یہ بستی اپنی تمام تر خامیوں اور خوبیوں سمیت سویرا کے من میں بسی ہوئی تھی۔ اس بستی کی گلیوں میں گھومنے والے لوگ' اس بستی کے گھروں میں جنم لینے والی کہانیاں' اس بستی کے تہوار اور موسم' سبھی کچھ سویرا کو پسند تھا۔ وہ ابھی نہا کر نکلی تھی

اور خوب نکھری ہوئی تھی۔ کھینچ تان کر اس نے پنکی عدنان اور زلفی کو بھی نہلایا تھا۔ اب وہ چھت پر پنکی کو اپنے گھٹنوں میں دبائے بیٹھی تھی اور اس کی کنگھی کر رہی تھی۔ پنکی کے بال بھی سویرا کی طرح نہایت گھنے تھے' کنگھی بالوں میں ڈوب ڈوب جا رہی تھی' ذرا زور بھی لگانا پڑ رہا تھا۔ پنکی بار بار احتجاجی سسکی بلند کرتی تھی۔ اچانک بیرونی دروازہ کھلا اور احسن کی آواز سنائی دی۔ پنکی فوراً بولی۔ "لو جی' آپ کے وہ آ گئے۔ اب میری جان چھوڑیئے۔"

اس سے پہلے کہ سویرا کچھ کہتی' پنکی مینڈک کی طرح اچھل کر اس کے گھٹنوں میں سے نکل گئی۔ سویرا نے بالوں سے بھری ہوئی کنگھی اس پر کھینچ ماری۔ پھر اس نے جلدی جلدی اپنے بھاری بھرکم بال جوڑے کی شکل میں سمیٹے۔ بدن پر پھنسی پھنسی سی ساٹن کی قمیض کو کھینچ کر برابر کیا اور سر پر اوڑھنی لیتے ہوئے نیچے اتر آئی۔ اتنی دیر میں احسن برآمدے میں داخل ہو چکا تھا اور اس کی چارپائی پر بیٹھا باتیں کر رہا تھا۔

اس کی باتوں سے معلوم ہوا کہ اس نے ابھی ایک گھنٹا پہلے ثاقب صاحب کے تیرہ ہزار روپے لوٹا دیئے ہیں اور ان سے باقاعدہ رسید حاصل کر لی ہے۔

سننے میں سویرا کو یہ خبر بڑی اچھی لگی کیونکہ آج صبح سویرے پھر ثاقب صاحب کا ملازم ریاض رقم کا تقاضا لے کر ان کے دروازے پر آیا تھا اور اس کا آنا سویرا سمیت سبھی کو بہت برا لگا تھا۔ اس واقعے کے بعد سویرا دیر تک آنسو بہاتی رہی تھی۔

سویرا کی امی نے کہا۔ "لیکن بیٹا' اتنے روپے تم نے لئے کہاں سے؟"

"بس لے لئے نا خالہ! آپ اب بس اتنا کریں کہ اس شخص کا مزید احسان لینا بند کر دیں۔ اللہ سبب الاسباب ہے۔ مشکل بعد میں پیدا کرتا ہے پہلے اس کا حل پیدا کرتا ہے۔ ہمارے مسئلے بھی انشاء اللہ حل ہو جائیں گے۔ بس........ آپ........ مجھ سے یہ وعدہ کریں کہ آئندہ یہ شخص اس چار دیواری میں نظر نہیں آئے گا۔"

سویرا کی امی کی آنکھوں میں آنسو امڈ آئے۔ "تیرا بڑا شکریہ بیٹا! لیکن اتنے سارے روپے؟"

دفعتاً بات سویرا کی سمجھ میں آ گئی۔ احسن کے آنے سے پہلے ہمیشہ اس کی موٹر

سائیکل کی آواز آیا کرتی تھی۔ آج یہ آواز نہیں آئی تھی۔ اس نے موٹر سائیکل بیچ دی تھی اور کارپوریشن کے راشی ٹاؤن آفیسر کا قرضہ چکا دیا تھا۔

اس نے بے حد شکوہ کناں نظروں سے احسن کی طرف دیکھا۔ اس نے سویرا سے نگاہیں چرا لیں۔ سویرا کے سینے میں احسن کے لئے محبت کی ایک بلند لہر اٹھی اور اس لہر میں اسے اپنا آپ ڈوبتا محسوس ہوا۔ اس کا دل چاہا' اس کے اور احسن کے درمیان دنیا کی کوئی دیوار نہ ہو۔ وہ یہ تین چار فٹ کا فاصلہ تڑپ کر طے کرے اور احسن کی بانہوں میں سما جائے۔ اس کے گلے سے لگ کر اتنا روئے کہ ساری حسرتیں' سارے غم آنسوؤں میں ڈھل کر بہہ جائیں۔

☆=========☆=========☆

توقیر چند روز بعد اسپتال سے گھر آ گیا تھا۔ اس کی حالت بہتر تھی لیکن وہ ابھی تک کمزور تھا۔ رنگ پیلا اور آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑ گئے تھے۔ سویرا اپنے بھائی کی صورت دیکھتی تھی اور پھر وہ ساری جسمانی' ذہنی اور معاشی کوفتیں اسے یاد آتی تھیں کہ ایک راہ چلتے بندے کا کسی پولیس کیس میں اچانک مشتبہ ٹھہر جانا کتنا بڑا سانحہ ہوتا ہے........ توقیر کو بھی وہ سب کچھ معلوم ہو گیا تھا جو اس کی غیر موجودگی میں پیش آیا تھا۔

ثاقب کی بے ہودگی یقیناً اسے بھی شاق گزرنی چاہئے تھی اور ممکن ہے گزری بھی ہو لیکن اس نے زبان سے اظہار نہیں کیا تھا۔ اس کی خاموشی سویرا کو اپنے سینے میں شدید چبھن کی طرح محسوس ہوئی تھی۔ احسن کے حوالے سے بھی توقیر نے اچھے خیالات کا اظہار نہیں کیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اس معاملے کو بگاڑنے میں احسن کا ہاتھ ہو سکتا ہے۔ کیونکہ وہ ثاقب صاحب سے خدا واسطے کا بیر رکھتا ہے۔

اسپتال سے گھر آنے کے دو تین روز بعد توقیر خود ثاقب صاحب سے ملنے گیا تھا۔ وہ ثاقب صاحب کی ناراضی دور کرنا چاہتا تھا۔ بعد ازاں وہ انہیں گھر بھی لایا تھا۔ تاہم یہ آمد بیٹھک تک ہی محدود رہی تھی۔ سویرا یا اس کی امی ثاقب صاحب سے نہیں ملی تھیں۔

اگلے روز سویرا کو معلوم ہوا تھا کہ ثاقب صاحب اور ان کے گھر والے اپنے ماڈل ٹاؤن والے شاندار مکان میں منتقل ہو گئے ہیں۔ اس کے سینے سے اطمینان کی سانس نکلی تھی۔

اس کے دل نے کہا تھا کہ اب اس بدنیت شخص سے واسطہ کم کم ہی رہے گا اور وہ ان تیز برمے جیسی نظروں سے محفوظ رہے گی جو گاہے گاہے اس کے جسم کو چھیدا کرتی تھیں اور اس کی حسِ شامہ اس کراہت آمیز بو سے بھی بچی رہے گی جو ثاقب کے بے ڈول جسم کا حصہ تھی۔ مگر مشیت ایزدی شاید سویرا کے خیالات پر مسکرا رہی تھی۔ جو کچھ ہونے والا تھا وہ اس کی توقعات کے بالکل برخلاف تھا۔

وہ اتوار کا دن تھا' اس روز احسن کو ان کے گھر آنا تھا۔ احسن نے کئی ماہ سے فرمائش کر رکھی تھی کہ سویرا اسے اپنے ہاتھ سے بریانی بنا کر کھلائے۔ نہ جانے کیوں ان دنوں سویرا کا دل نہیں چاہ رہا تھا کہ وہ احسن کی کوئی بات ٹالے۔ اس نے بڑی خاموشی سے سویرا اور اس کے اہل خانہ کے لئے بہت بڑا کام کیا تھا۔ اس نے موٹر سائیکل فروخت کردی تھی اور عین اس وقت کی تھی جب وہ موٹر سائیکل اس کے لئے روزگار کا ایک اچھا موقع فراہم کرنے والی تھی۔ اس موٹر سائیکل کے ساتھ احسن نے کئی دیرینہ خواہشات وابستہ کر رکھی تھیں۔ جن میں سے ایک خواہش یہ بھی تھی کہ وہ کسی دن سویرا کو اس موٹر سائیکل پر اپنے پیچھے بٹھائے گا اور وہ دونوں شام کے جھٹ پٹے میں شاہراہ قائداعظم کی روشنیوں میں دور تک چلتے چلے جائیں گے۔ سویرا کا بازو اس کی کمر میں ہوگا۔ ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے۔ اب وہ شاخ ہی نہیں رہی تھی جس پہ یہ آشیانہ بن سکتا۔ یعنی موٹر سائیکل بک چکی تھی۔

سویرا جانتی تھی کہ بریانی پکانے کے بعد اسے مہینے کی آخری تین چار تاریخیں بڑی مشکل سے گزارنی ہوں گی۔ بہرحال اس نے بریانی پکا ڈالی تھی۔ چاول احسن کو بچپن سے بہت پسند تھے۔ ان کی خوشبو جیسے اسے دور سے اپنی طرف کھینچ لایا کرتی تھی۔ سویرا کو بچپن اور لڑکپن کے وہ دن یاد تھے جب بھی چاول پکتے تھے' احسن آن وارد ہوتا تھا۔

اس روز توقیر بھی قدرے اچھے موڈ میں تھا۔ احسن کے آتے ہی گھر میں مسکراہٹوں اور قہقہوں کی آمد ہوگئی۔ کچھ دیر کے لئے اپنے اپنے مصائب کو بھول کر وہ لوگ چھوٹی چھوٹی خوشیوں سے لطف اندوز ہونے لگے۔ انسان عجیب الخلقت چیز ہے۔ برے سے برے حالات میں بھی اپنے لئے سکون اور خود فراموشی کی گھڑیاں ڈھونڈ لیتا ہے۔ شاید اسی لئے

کہا جاتا ہے کہ نیند سولی پر بھی آجاتی ہے۔ جس طرح دیر تک نہ اندھیرا رہ سکتا ہے اور نہ اجالا۔ اسی طرح کوئی شخص دیر تک غم زدہ رہ سکتا ہے اور نہ دیر تک خوش۔

سویرا بھی اس روز خود کو برزخ میں محسوس کر رہی تھی۔ سب بہت خوش تھے۔ وہ دھوپ تاپنے کے لئے چھت پر چلے گئے۔ احسن' عدنان اور دانش پتنگ اڑانے لگے۔ توقیر امی کے پاس بیٹھ گیا اور سب کو مالٹے چھیل چھیل کر دینے لگا۔ پھر شام ہوگئی۔ وہی شام جو سیدھی سویرا کے دل میں اتر جایا کرتی تھی۔ کتنی عجیب بات تھی' اس کا نام سویرا تھا لیکن اسے شام پسند تھی اور سرما کی گلابی شام میں تو اس کی جان تھی۔

اندھیرا ہونے سے ذرا پہلے سویرا بریانی پکانے کے لئے نچلی منزل پر آگئی۔ باقی لوگ چھت پر ہی ہلا گلا کرتے رہے۔ چاولوں کی خوشبو سارے میں پھیلی تو احسن سیڑھیاں اترتا ہوا کچن میں آگیا۔

سویرا مسکرائی۔ "غلطی میری ہے۔ مجھے چاولوں پر سے ڈھکن ہٹانا ہی نہیں چاہئے تھا۔"

"کیوں؟"

"خوشبو تمہیں کھینچ لائی ہے۔"

"خوشبو نہیں' خوشبوئیں!"

"کیا مطلب؟"

"یہاں دو خوشبوئیں موجود ہیں۔ ایک خوشبو پر تو تم ڈھکنا رکھ سکتی ہو لیکن دوسری مہک جو تمہاری اپنی ہے' کسی ڈھکنے سے چھپنے والی نہیں۔"

سویرا کے کانوں کی لویں سرخ ہوگئیں "اب زیادہ باتیں نہ بناؤ اور دوسرے لوگوں کے پاس اوپر چلے جاؤ۔ میں ابھی بلاتی ہوں آپ سب کو۔"

اچانک دھماکا ہوا اور لائٹ چلی گئی۔ دھاتی تار کی پتنگ نے قرب و جوار کو تاریکی میں ڈبو دیا تھا۔ سویرا کے ہونٹوں سے "ہائے" کی آواز نکل گئی۔ احسن اس سے چند قدم کی دوری پر کھڑا تھا۔ تاریکی اور جذبات کا خدا جانے کیا رشتہ ہے' باہر ایک روشنی بجھتی ہے تو اندر جل اٹھتی ہے۔ احسن نے عجیب لرزاں لہجے میں کہا "سویرا! ایک بار.........

تت........ تمہیں گلے لگا سکتا ہوں۔"

سویرا کا دل جیسے اس کی کنپٹیوں میں دھڑکنے لگا۔ "کیسی باتیں کر رہے ہو۔ جاؤ........ کوئی آجائے گا" وہ گھبرا کر بولی۔

"پلیز سویرا!........ پلیز........ پلیز........" اس نے ایسے ملتجیانہ لہجے میں کہا کہ سویرا کی دھڑکنیں زیر و زبر ہو گئیں۔

نہ جانے کیوں' ایسے لمحوں میں وہ اسے ایک معصوم ضدی بچے جیسا لگتا تھا۔ اڑیل مگر پیارا۔ وہ چند لمحے ساکت کھڑی رہی۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔ کہنے کو تو احسن نے ایک بات کہہ دی تھی۔ مگر اپنا اور سویرا کا درمیانی فاصلہ طے کرنا اس کے لئے بھی شاید ایک طویل کٹھن سفر جیسا تھا۔

سویرا کو لگا کہ وہ کھڑی رہی تو حدت سے پگھل جائے گی۔ "تم جاتے ہو کہ نہیں؟" اس نے اپنے دونوں ہاتھ احسن کے سینے پر رکھے اور اسے دروازے کی طرف دھکیلا۔

وہ پیچھے ہٹنے لگا۔ وہ اسے ہٹانے لگی لیکن ساتھ ساتھ شاید چاہ بھی رہی تھی کہ وہ اس موقع سے فائدہ اٹھا لے' اسے گلے سے لگا لے۔ سویرا کی سوچ جیسے ہوا کی لہر پر سفر کر کے احسن کے دماغ میں پہنچ گئی۔ وہ قریب تو پہلے ہی تھی۔ بس احسن کو بازو پھیلانے کی ضرورت تھی۔ اس نے بازوؤں کو حرکت دی اور اسے گلے سے لگا لیا۔ کائنات کی گردش میں جیسے وقفہ آگیا۔ وہ چند سیکنڈ تک اسی طرح بت بنے کھڑے رہے۔ بس ان کے دل دھڑک رہے تھے۔ احسن کے ہونٹ اس کے ریشمی بالوں پر دھرے تھے۔ پھر وہ ایک دوسرے سے جدا ہو گئے۔ سیڑھیوں پر قدموں کی چاپ سنائی دے رہی تھی۔

"اب جاؤ بابا!" سویرا نے اسے باقاعدہ دھکیل کر باہر نکال دیا۔

آدھ پون گھنٹے میں کھانا تیار ہو گیا۔ سب لوگ چھت سے نیچے آگئے اور دستر خوان پر بیٹھ گئے۔ بریانی عدنان اور پنکی کی بھی پسندیدہ ڈش تھی۔ جب سے ابو فوت ہوئے تھے۔ انہوں نے شاید ایک دو بار ہی بریانی پکائی تھی۔ عدنان پنکی اور دوسرے بچوں کے چہرے پر رونق دیکھ کر سویرا کا اپنا دل بھی اندر سے جگمگا اٹھا تھا۔ وہ ان سب کو ایسے ہی خوش دیکھنا چاہتی تھی۔ اس کے بس میں ہوتا تو دنیا جہان کی خوشیاں ان کے قدموں میں ڈھیر کر دیتی۔

وہ نیچے سے اضافی چمچ لینے آئی تھی' جب دروازے پر دستک سن کر دروازے کی طرف چلی گئی۔ اس نے دروازہ کھولا' سامنے سانولی سی رنگت والے دو افراد کھڑے تھے۔ انہوں نے کہا۔ "گھر میں کوئی مرد ہے؟"

ان کے انداز نے سویرا کو ٹھٹکا دیا' وہ بولی۔ "جی نہیں۔ آپ نے جو کہنا ہے مجھ سے کہیں۔"

انہوں نے آپس میں کوئی بات کی پھر ایک کاغذ سویرا کی طرف بڑھا دیا۔ وہ ایک سرکاری نوٹس تھا۔ نوٹس کی وصولی کے دستخط انہوں نے ایک دوسرے کاغذ پر سویرا سے کرالئے۔

سویرا نے نوٹس پر نگاہ دوڑائی اور اس کا سر جیسے گھومنے لگا۔ نوٹس میونسپل کارپوریشن کی طرف سے تھا۔ نوٹس کا عنوان "آخری نوٹس" تھا اور یہ سویرا کے والد مرحوم کے نام تھا۔ نوٹس میں لکھا تھا کہ آپ کا مکان جس زمین پر تعمیر کیا گیا ہے وہ محکمہ آثار قدیمہ کی ملکیت ہے۔ لہٰذا آپ کو اس آخری نوٹس کے ذریعے مطلع کیا جاتا ہے کہ آئندہ چوبیس گھنٹے میں بلڈنگ مسمار کر دیں ورنہ محکمہ یہ بلڈنگ مسمار کرے گا اور اس کا خرچہ آپ سے لیا جائے گا وغیرہ وغیرہ۔

سویرا نے لرزتے ہاتھوں سے یہ نوٹس عدنان کی کاپی میں چھپا دیا اور خود چمچ وغیرہ لے کر واپس اوپر چلی گئی۔ سب نے اطمینان سے کھانا کھایا اور باتیں وغیرہ کرتے رہے۔ وہ بھی ان باتوں میں شریک رہی لیکن اس کا دل اندر سے ہولتا رہا۔ وہ ہمیشہ سے ایسی ہی تھی۔ ہر دکھ اپنے اندر سمیٹ لینا چاہتی تھی۔ اس درخت کی طرح جو دھوپ میں جل کر چھاؤں دیتا ہے۔ اس کا بس چلتا تو وہ اپنے اہلِ خانہ کے سامنے ایک ایسی ڈھال بن کر کھڑی ہو جاتی جس سے زمانے کا ہر وار ٹکرا کر بے اثر ہو جاتا۔

رات کو جب سب سونے کے لئے لیٹ رہے تھے' سویرا نے توقیر کو نوٹس دکھایا اور ساری بات بتائی۔ اس کا رنگ بھی زرد ہو گیا۔ اسی وقت کپڑے بدل کر وہ باہر نکل گیا۔ اس کی واپسی رات بارہ ایک بجے ہوئی۔ منہ لٹکا ہوا تھا۔ اس نے کہا۔ "بڑا غضب ہوا ہے سویرا۔ اس کیس کی فائل پھر کھل چکی ہے۔ کارپوریشن کی طرف سے آخری نوٹس جاری

ہو گیا ہے۔"

"لیکن ہمیں تو اس سے پہلے کوئی نوٹس نہیں ملا۔"

"لگتا ہے کہ نوٹس جاری ہوتے رہے ہیں لیکن ہم تک پہنچے نہیں' یا پھر دفتر میں ہی کسی نے پھاڑ ڈالے ہیں۔"

"اب کیا ہو گا؟"

"کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ ممکن ہے کہ عدالت سے رجوع کرنے کی گنجائش ہو لیکن یہ بھی صبح ہی معلوم ہو سکے گا۔ صبح ویسے بھی اسٹرائیک ہے۔ کچھ کہہ نہیں سکتے کہ عدالتیں بھی کھلیں گی یا نہیں؟"

سویرا کی ہتھیلیاں پسینے میں تر ہو گئی تھیں۔ وہ روہانسا ہو کر بولی۔ "بھائی' ہم نے یا ابو نے کیا جرم کیا ہے؟ ہم نے اس جگہ کی قیمت ادا کی تھی۔ ہمارے پاس کاغذ ہیں پھر یہ لوگ ہمیں گھر سے بے گھر کیوں کر رہے ہیں۔ یہ کہاں کا انصاف ہے۔ ایک طرف تو کروڑوں کی ناجائز زمین پر پلازے بن رہے ہیں' ایک طرف ایک جائز زمین پر ہم اپنی چھت کے نیچے نہیں رہ سکتے۔ دو ٹوٹی پھوٹی دیواریں ہیں جنہیں یہ لوگ آثار قدیمہ قرار دے رہے ہیں اور وہ دیواریں بھی ہمارے گھر سے سو گز دور ہیں۔"

توقیر نے سراسیمہ لہجے میں کہا۔ "مجھے تو شک پڑتا ہے' یہ سب ثاقب بشیر کا کیا دھرا ہے۔ اگر اس نے نہیں کیا تو اس کی شہ پر کسی نے کیا ہے۔"

"لیکن اب تو اس کی ناراضگی ختم ہو گئی تھی۔ وہ آپ کے ساتھ گھر بھی آیا تھا۔"

توقیر نے مایوسی سے سر ہلایا۔ "میرا خیال ہے کہ ہم لوگوں کو اس سے بگاڑنی ہی نہیں چاہئے تھی۔ اگر یہ بے وقوف احسن اتنی تیزی نہ دکھاتا تو شاید وہ بات وہیں ٹھپ ہو جاتی۔ اس نے روپے دے کر ثاقب بشیر سے باقاعدہ رسید لی اور سخت باتیں بھی کیں۔"

سویرا کی زبان پر حرفِ احتجاج آتے آتے رہ گیا۔ اس پریشان کن موقع پر وہ کوئی اختلافی بات کہہ کر بھائی کو مزید پریشان کرنا نہیں چاہتی تھی۔

اگلے دو روز ان لوگوں نے بے حد سراسیمگی اور اذیت میں گزارے۔ توقیر اپنے

ایک دو واقف کاروں کے ساتھ مل کر بہت بھاگ دوڑ کرتا رہا لیکن کچھ نہیں بنا۔ بس اتنا ہوا کہ محکمے کی طرف سے چند دن کی مہلت اور مل گئی۔ توقیر پہلے بھی پوری طرح صحتمند نہیں تھا' اس پریشانی اور بھاگ دوڑ نے اسے پھر بیمار کر دیا۔ پولیس کی مار نے اس کی ہڈیاں پلپلی کر دی تھیں۔ ایک رات گیارہ بارہ بجے وہ گھر واپس آیا تو اس کی کمر کے نچلے حصے میں ناقابل برداشت درد شروع ہو گیا۔ وہ ساری رات تڑپتا رہا۔ علی الصبح اسے اسپتال میں داخل کرانا پڑا۔ اس کی بیماری نے بیمار والدہ کو بھی اور بیمار کر دیا تھا۔ گھر کی روٹی مشکل سے چل رہی تھی۔ اب دو دو مریضوں کا علاج کہاں سے ہوتا۔ دوسرے روز احسن صبح سویرے گھر آیا۔ وہ اسپتال میں توقیر کے پاس تھا اور رات بھر کا جاگا ہوا تھا۔ اس نے بتایا کہ توقیر کی کمر کے لئے ڈاکٹر نے آپریشن تجویز کیا ہے۔ یہ ایک "رسکی" آپریشن تھا اور اس پر کم از کم دس گیارہ ہزار کا خرچہ بھی اٹھنا تھا۔ ڈھائی تین ہزار تو احسن بھی کسی طرح کر سکتا تھا' باقی روپے کہاں سے آتے.......... یہ بھی ضروری تھا کہ آپریشن فوری ہو ورنہ ٹانگوں کے متاثر ہونے کا اندیشہ تھا۔

احسن کے جانے کے بعد سویرا نے بچوں کو تیار کر کے اسکول بھیجا پھر دیر تک بیٹھی سوچتی رہی۔ سارا دن شدید پریشانی اور تذبذب میں گزرا۔ شام کے وقت اس کے دل میں نہ جانے کیا آئی کہ اس نے چادر لی اور ویگن میں بیٹھ کر ماڈل ٹاؤن جا پہنچی۔ ثاقب کے گھر کا پتا اس کے پاس موجود تھا۔ خوش قسمتی سے ثاقب بشیر گھر میں ہی تھا۔ اس نے اب ایک خیبر گاڑی خرید لی تھی۔ یہ گاڑی شاندار کوٹھی کے پورچ میں ہی موجود تھی۔ جیسا کہ سویرا کو بعد میں معلوم ہوا یہ گاڑی اس نے اپنے بھائی عارف کے نام پر لی تھی۔ بھائی کوٹھیاں بنا کر بیچنے کا دھندا کرتا تھا۔ مگر اس "ٹھیکے دار صاحب" کی اتنی آمدنی نہیں تھی جتنی ایک معمولی سرکاری ملازم ثاقب بشیر کی تھی۔

ثاقب بشیر سے سویرا کی ملاقات گھر کے وسیع ڈرائنگ روم میں ہوئی۔ ثاقب بڑی خوش اخلاقی سے پیش آیا۔ سویرا کو اپنے گھر میں دیکھ کر ثاقب کو جو خوشی ہوئی تھی' اس کے سبب اس کا سانولا رنگ مزید سانولا ہو گیا تھا۔

"کہو سویرا! کیسے آئی ہو؟"

جواب میں سویرا کی آنکھوں میں آنسو چمک گئے اور اس نے وہ سب کچھ ثاقب سے کہہ دیا جو غالباً وہ پہلے ہی جانتا تھا۔ سویرا نے بے چارگی کے لہجے میں کہا۔ ”اس وقت آپ ہی ہماری مدد کرسکتے ہیں۔ محکمے کی طرف سے مسلسل نوٹس آرہے ہیں۔ اس پریشانی نے توقیر کو بیمار بھی کیا ہے۔ پلیز‘ آپ اس سلسلے میں کچھ کریں۔“

اپنے ان چار فقروں میں سویرا نے دو تین بار کوشش کی کہ ثاقب کو انکل کہہ سکے لیکن یہ لفظ اس کی زبان پر نہیں آیا۔ سویرا کو یوں لگا جیسے ثاقب صاحب نے بھی یہ سب کچھ محسوس کیا ہے۔ جہاں جہاں اس نے انکل استعمال کرنے کی ناکام کوشش کی تھی‘ وہیں وہیں ثاقب صاحب کو اپنی فتح مندی اور سویرا کی بے بسی کا احساس ہوا تھا۔

ثاقب نے سویرا کی اجازت کے بغیر ہی سگریٹ سلگایا اور بولا۔ ”معاملہ بڑا الجھا ہے‘ اب اسے سنبھالنے کے لئے بڑے ہاتھ پاؤں مارنے پڑیں گے۔ بہرحال اب تم نے کہا ہے تو کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی پڑے گا۔ میں اپنی طرف سے پوری کوشش کرتا ہوں۔“

”سب ٹھیک ہو جائے گا نا؟“ سویرا نے پوچھا۔

”حوصلہ رکھو۔ امید پر ہی دنیا قائم ہے۔“

پھر ثاقب نے سویرا کو بتایا کہ اس نے سویرا کے ابو مرحوم کو دو تین کاغذات بنوا کر دیئے تھے۔ وہ درکار ہوں گے یا پھر ان کی فوٹو اسٹیٹ!

سویرا نے کہا۔ ”ابو کے سارے کاغذات اسی طرح سنبھالے رکھے ہیں۔ میں ابھی جا کر دیکھ لیتی ہوں..........!“ آخر میں وہ پھر انکل کہتے کہتے رہ گئی تھی۔

وہ بولے۔ ”ٹھیک ہے۔ میں کل تمہاری طرف آؤں گا۔ تم کاغذات علیحدہ کر چھوڑنا۔“

ثاقب سے باتوں کے دوران میں ہی‘ ثاقب کے چھوٹے بھائی کی بیوی سعدیہ اور بچے بھی آگئے۔ سویرا نے کچھ دیر ان لوگوں سے بات چیت کی۔ اس بات چیت کے دوران میں ہی سویرا کو معلوم ہوا کہ ثاقب اور اس کی بیوی میں طلاق ہوگئی ہے۔

دوسرے روز جب بچے اسکول جا چکے تھے اور سویرا اپنی والدہ کے ساتھ گھر میں اکیلی تھی‘ ثاقب بشیر آدھمکا۔ سویرا نے کاغذات رات کو ہی نکال کر رکھ لئے تھے۔ اس کا

خیال تھا کہ وہ جلدی میں آئے گا اور چلا جائے گا۔ مگر کاغذات وغیرہ دیکھنے کے بعد بھی وہ اطمینان سے بیٹھا رہا۔ سویرا کی والدہ کے سامنے اپنا رونا رونے لگا۔ (وہ سویرا کی امی کو بڑی آپا کہتا تھا) اس کی باتوں کا لبِ لباب یہ تھا کہ عورت کے بغیر بندے کی کوئی زندگی نہیں۔ نہ وقت پر کھانا‘ نہ کپڑے‘ نہ توجہ.......... کہنے لگا۔ ”اب دیکھیں آپا جی! پرسوں سے دانت میں سخت درد ہے۔ ایک لقمہ بھی نہیں لیا جاتا۔ کل دودھ پی کر سو گیا تھا۔ آج کچھ کھایا ہی نہیں۔“

سویرا کی والدہ بولی۔ ”سویرا! کھڑی کیا دیکھ رہی ہے‘ جا ثاقب کے لئے تھوڑا سا دلیہ ہی بنا لے۔“

سویرا ”جی اچھا“ کہتی ہوئی فوراً باورچی خانے میں چلی گئی۔ گندم کا دودھ والا دلیہ تیار ہونے میں پون گھنٹہ لگ گیا۔ اس دوران میں ثاقب اطمینان سے سویرا کی والدہ کے پاس بیٹھا باتیں کرتا رہا۔ مکان اور کارپوریشن والے معاملے کی اسے جیسے کوئی فکر ہی نہیں تھی۔ ایک دو بار سویرا نے کہا تو وہ بولا۔ ”بس اس کی فکر نہ کریں۔ اللہ نے چاہا تو اب ہو جائے گا کام.......... میں نے ایک دو بندوں کی ڈیوٹی لگائی ہوئی ہے۔ آج نہیں تو کل شام تک سب کچھ سامنے آجائے گا۔“

بارہ بجے کے قریب ثاقب جانے لگا تو سویرا کی والدہ کے منہ سے نکل گیا۔ ”شام کو کھانا ادھر ہی کھا لینا۔“

وہ بولا ”نہیں بڑی آپا! آج تو ایک میٹنگ میں جانا ہے۔ دیر ہو جائے گی۔ کل دوپہر کو شاید چکر لگے۔ ایک وکالت نامے پر آپ کے دستخط کرانے ہوں گے۔“

”تو چلو ٹھیک ہے‘ دوپہر کو سہی۔“ سویرا کی والدہ نے کہا۔

دروازے کی طرف جاتے جاتے ثاقب رک گیا اور عام سے لہجے میں بولا۔ ”بڑی آپا! توقیر کے علاج کی فکر نہ کرنا۔ اللہ نے چاہا تو سب انتظام ہو جائے گا۔ میں یہاں سے اسپتال ہی جا رہا ہوں۔“

سویرا کی والدہ کچھ نہ بول سکیں۔ بس آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرتے رہے۔

ثاقب کے جانے کے بعد سویرا کی والدہ اسے سمجھانے لگیں کہ ہمیں ہر صورت

ثاقب کے ساتھ بنا کر رکھنی چاہئے۔ یہ مشکل میں کام آنے والا بندہ ہے۔ پھر سویرا کی والدہ نے سویرا کو اس کے والد کا حوالہ بھی دیا' کہنے لگیں۔ "شاید تمہیں یاد ہو۔ اللہ بخشے تمہارے ابو کہا کرتے تھے کہ ثاقب گھر کے فرد کی طرح ہے۔ کوئی مسئلہ ہو تو اس سے مشورہ کیا کرو۔"

"لیکن امی جان! ابو یہ بات توقیر سے کہا کرتے تھے' ہم سے تو نہیں کہتے تھے۔"

"تو کیا ہم توقیر سے اور اس کی پریشانیوں سے الگ ہیں؟" امی نے ناراضی سے کہا۔

"مگر.........."

"ایک تو تم ہر بات میں مین میخ بہت نکالتی ہو۔" انہوں نے سویرا کی بات کاٹی۔ "اب دیکھو' اس مصیبت میں کون آیا ہے ہمارے پاس.......... وہی آیا ہے نا؟"

"اچھا چھوڑیں اس بات کو۔" سویرا ہاری ہوئی آواز میں بولی۔ "کل پکانا کیا ہے؟"

"چاول وغیرہ پکا لینا۔ عدنان سے کہہ کر ایک مرغی منگوا لو۔ کل کاپیوں کی تھوڑی سی ردی بیچی تھی میں نے.......... ٹوکری کے نیچے بیس روپے پڑے ہیں' کلو دودھ منگوا لو۔ تھوڑی سی فرنی بھی بنا لینا۔"

بچوں کو اسکول بھیجنے کے بعد سویرا نے جلدی جلدی گھر کی صفائی کی اور پھر باورچی خانے میں چلی گئی۔ اسی دوران میں سویرا کی والدہ بھی اسپتال میں توقیر کو کھانا وغیرہ دے کر واپس آگئیں۔ سویرا نے انہیں تاکید کی تھی کہ ثاقب صاحب کے آنے سے پہلے وہ گھر پہنچ جائیں۔ والدہ نے آکر سویرا کو بتایا کہ ثاقب توقیر کے علاج کے لئے بڑی کوشش کررہا ہے۔ کل شام ہی اس نے توقیر کے آپریشن کے لئے فیس جمع کرا دی تھی اور ضروری سامان بھی لا دیا تھا۔ آپریشن دو تین روز تک متوقع تھا۔

باورچی خانے میں سارا کام سویرا کو خود ہی کرنا ہوتا تھا۔ امی بس کبھی کبھی کمرے میں سے آواز دے کر پوچھ لیا کرتی تھیں کہ وہ کیا کررہی ہے۔ ثاقب صاحب کو بارہ بجے آنا تھا۔ ساڑھے گیارہ بجے کے قریب احسن آگیا۔ احسن کے آتے ہی سویرا نے امی کو اشارے سے کہہ دیا تھا کہ وہ احسن کو ثاقب صاحب کی آمد کے بارے میں کچھ نہ بتائیں۔

احسن کے بال بکھرے ہوئے تھے' چہرہ زرد اور آنکھوں میں رت جگا تھا۔ اس نے

اپنی گھسی ہوئی جینز کی پچھلی جیب سے چند مڑے تڑے نوٹ نکالے اور سویرا کی امی کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ "خالہ' یہ چار ہزار روپے ہیں' دو ہزار میرے پاس تھے' دو ہزار ایک دوست سے ادھار لئے ہیں۔ مہینے تک لوٹانے ہوں گے۔ ابھی تقریباً چھ سات ہزار اور چاہئیں۔ میں کوشش کررہا ہوں' آپ بھی کریں۔ اللہ کوئی سبب لگا دے گا۔"

سویرا نے آنکھ کے اشارے سے امی کو کہا کہ روپے نہ رکھیں۔ سویرا کی امی نے بڑے پیار سے بھانجے کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ اس کا ماتھا چوما اور بولیں۔ "تیرا پہلے ہی بڑا احسان ہے پتر! توقیر سے بڑھ کر تم ہمارا خیال رکھتے ہو۔ بہرحال ابھی ان پیسوں کی ضرورت نہیں۔ ضرورت ہوگی تو تمہیں بتادوں گی۔"

"لیکن خالہ! توقیر کا آپریشن؟"

"اس کا انتظام ہوگیا ہے پتر!"

"لیکن کیسے؟"

سویرا کی امی پہلے تو جھوٹ بولنے سے ہچکچاتی رہیں پھر انہوں نے کہا۔ "بس اللہ نے رحمت کا ایک فرشتہ بھیج دیا تھا۔ توقیر کے ابو سے کسی نے ادھار لیا ہوا تھا۔ وہ آکر واپس کرگیا ہے۔"

معلوم نہیں کہ خالہ کی وضاحت کا احسن کو یقین آیا یا نہیں مگر وہ خاموش ضرور ہوگیا۔ ظاہر ہے کہ سات ہزار روپے جمع کرنا اسے بھی پہاڑ سر کرنے کے برابر لگ رہا تھا۔ وہ سر کھجاتے ہوئے بولا۔ "کچھ بھی ہے خالہ جی! بس ایک بات کا خیال رکھنا۔ اس رشوت خور کا ایک پائی کا احسان بھی سر پر نہ لینا۔" اس کا اشارہ ثاقب کی طرف ہی تھا۔

سویرا کی امی بس نفی میں سرہلا کر رہ گئیں۔

اب سویرا کی امی اور سویرا یہی چاہ رہی تھیں کہ احسن جلد سے جلد یہاں سے چلا جائے۔ اس دن کی طرح آج بھی گھر میں بریانی پکی ہوئی تھی لیکن آج یہ بریانی احسن کے لئے نہیں تھی۔ چاولوں کی خوشبو احسن کو کچن میں کھینچ لائی۔ وہ کچھ دیر بیٹھنا چاہتا تھا۔ شاید اسے بھوک بھی لگی تھی مگر سویرا جلد از جلد اسے روانہ کرنا چاہتی تھی اور جب کوئی مہمان کو روانہ کرنا چاہتا ہو اور مہمان روانہ نہ ہونا چاہتا ہو تو عجیب سی صورت حال پیدا ہو

جاتی ہے۔ گفتگو جوں کی توں رہے تو کھنچاؤ بڑھتا چلا جاتا ہے۔ ایسے موقع پر سمجھ دار مہمان وہی ہوتا ہے جو میزبان کا مطمع نظر سمجھ جاتا ہے اور باعزت رخصت ہو جاتا ہے۔ احسن بھی ناسمجھ نہیں تھا۔ لہٰذا چاولوں اور سویرا کی پسندیدہ خوشبوؤں کو چھوڑ کر وہ جلد ہی وہاں سے چلا گیا۔ اس کی صورت سویرا کو بتا رہی تھی کہ وہ بہت بجھے دل کے ساتھ وہاں سے جا رہا ہے۔

اس کے جانے کے بعد سویرا نے بمشکل آنسو ضبط کئے۔ کیسے حالات تھے کہ وہ احسن کی خواہش کے باوجود اسے دو لقمے چاول نہیں کھلا سکی تھی۔ اس کی صورت سے لگ رہا تھا کہ اس نے ناشتہ نہیں کیا اور شاید رات کا کھانا بھی نہیں کھایا تھا' وہ بھاگ دوڑ کر رہا تھا اور یہ بھاگ دوڑ ان لوگوں کے لئے ہی تو تھی۔ وہ بے چارہ چاہتا تھا کہ ثاقب کا داخلہ اس گھر میں کم سے کم ہو لیکن حالات ایسے ہوگئے تھے کہ ثاقب کے بجائے اس کا اپنا داخلہ اس کے گھر میں بند ہو رہا تھا۔ موٹر سائیکل کے بعد اس غریب کے پاس کوئی ایسا اثاثہ نہیں تھا جسے بیچ کر وہ اس گھر میں ثاقب کا راستہ بند کر سکتا۔

احسن کے جانے کے تھوڑی ہی دیر بعد ثاقب بشیر آدھمکا.......... حسب معمول مفلر اس کے کانوں کو ڈھانپے ہوئے تھا۔ وہ دو بڑے بڑے لفافوں میں فروٹ لایا تھا۔ بچوں کے لئے چاکلیٹ وغیرہ علیحدہ لفافے میں تھیں۔

اس نے سویرا کو تسلی دی کہ اب محکمے کی طرف سے کسی فوری ایکشن کا خطرہ ٹل گیا ہے' کل تک عدالت سے "اسٹے" مل جائے گا اور پھر یہ کام لمبا لیٹ جائے گا۔ اس نے وکالت نامے پر سویرا کی امی سے دستخط کرائے اور ایک دو ضروری "ڈاکومینٹس" حاصل کئے۔ کھانے کے دوران میں بھی وہ بڑی لگاوٹ اور اپنائیت کے ساتھ باتیں کرتا رہا۔ اس کی نگاہیں رہ رہ کر سویرا کی طرف اٹھ جاتی تھیں۔ یہ بالکل غیرارادی سی نگاہیں تھیں۔ جیسے ثاقب کو خود بھی علم نہ ہو کہ وہ کتنی حریص اور بے باک نظروں سے سویرا کو دیکھ رہا ہے۔ وہی دہکی ہوئی دو سلاخیں سویرا کے نازک بدن کو داغنے اور چھیدنے لگیں۔ تنہا ان دہکی ہوئی سلاخوں کی اذیت ہوتی تو بھی کوئی بات تھی.......... ان سلاخوں کے ساتھ ساتھ وہ ناگوار بو بھی سویرا کے حواس کو مختل کرتی تھی جو ثاقب کی شخصیت کا جزو لاینفک تھی۔

یہ مردار کی سی بو تھی۔ شاید اس کا سبب وہی مردار (رشوت) ہو جو وہ ڈنکے کی چوٹ پر کھاتا تھا۔

سویرا اس وقت کچن میں چائے بنا رہی تھی جب بیرونی دروازے پر دستک ہوئی۔ معلوم ہوا کہ ایک قریبی گھر میں موت ہوگئی ہے۔ سویرا کی امی نے اسی وقت برقعہ پہنا اور موت والے گھر میں چلی گئیں۔ ثاقب اور سویرا گھر میں تنہا رہ گئے۔ یہ صورت حال سویرا کے لئے الجھن کا باعث تھی' مگر وہ مجبور تھی۔

وہ چائے دینے کے لئے کمرے میں آئی تو ثاقب صاحب کی نظروں سے چھلکتی حرص اور بے باکی نمایاں تر دکھائی دی۔ درحقیقت تین دن پہلے جب ثاقب صاحب کو انکل کہتے ہوئے سویرا کی زبان لڑکھڑائی تھی۔ اسی وقت ان دونوں کے نئے تعلق کا رخ متعین ہوگیا تھا.......... سڑپ سڑپ چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے ثاقب صاحب گفتگو بھی فرماتے رہے۔ اس بین السطور گفتگو کا خلاصہ یہی تھا کہ حالات بڑے سنگین ہیں۔ اب سب کچھ سویرا پر منحصر ہے۔ اگر وہ اپنا رویہ ثاقب صاحب کے ساتھ ٹھیک رکھے گی تو وہ بھی تن من سے ان کی مدد کریں گے۔ دوسری صورت میں وہ اپنی نگاہ التفات کا رخ پھیر لیں گے جس کے بعد کچھ بھی ہو سکتا ہے۔

گفتگو کے دوران میں ہی ثاقب صاحب نے اچانک پرانا موضوع چھیڑ دیا۔ "اس دن تم نے بڑی سنگدلی دکھائی تھی۔ میں کتنے خلوص سے وہ بالیاں لایا تھا۔ تم نے انہیں ہاتھ تک لگا کر نہیں دیکھا۔"

"ب.......... بس وہ.......... دراصل۔"

ثاقب نے کہا۔ "یقین کرو' وہ بالیاں' اس دن سے میرے کوٹ کی جیب میں پڑی ہیں.......... یہ دیکھو.........."

ثاقب نے اندرونی جیب میں ہاتھ ڈال کر بالیاں نکال لیں۔

سویرا خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر رہ گئی۔ ثاقب کہہ نہیں رہا تھا ورنہ اس کی دلی تمنا یہی تھی کہ سویرا بالیاں لے لے۔ سویرا کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔ ثاقب چائے کی چسکیاں لیتا رہا اور خاموشی سے سویرا کی طرف دیکھتا رہا۔ سویرا محسوس کررہی تھی کہ

ثاقب کی خاموشی بتدریج ناراضگی میں بدل رہی ہے۔ اس کے چہرے کا سانولا رنگ کچھ اور سانولا ہوگیا تھا۔ وہ یہ سوچ کر لرز گئی کہ اس دن کی طرح آج یہ پھر ناخوش چلا گیا تو کیا ہوگا۔

"کیا بات ہے آپ چپ کیوں ہوگئے؟" وہ ہمت کر کے بولی۔

"کچھ نہیں! سوچ رہا ہوں کہ بندے کو اپنی اوقات کے اندر ہی رہنا چاہئے۔"

"اگر میری وجہ سے کوئی پریشانی ہوئی ہے تو میں معذرت چاہتی ہوں۔ دراصل.........."

"معذرت تو مجھے کرنی چاہئے۔" ثاقب نے روکھے لہجے میں کہا۔ "مجھے کیا حق تھا۔ تم سے پوچھے بغیر تمہارے لئے بالیاں لے آیا۔ ہر تحفہ تو قبول کئے جانے کے قابل نہیں ہوتا۔"

"بات یہ نہیں ہے ثاقب صاحب!"

"اگر نہیں ہے تو پھر تم یہ رکھ کیوں نہیں لیتیں؟"

سویرا کے کانوں کی لویں تپ گئیں۔ اس نے تپائی پر رکھی بالیوں کی طرف دیکھا۔ اسے لگا کہ یہ بالیاں نہیں دو دہکتے ہوئے انگارے ہیں۔ اگر اس نے یہ اٹھا لئے تو ان کی جان لیوا حدت اس کے ہاتھوں میں سرایت کرتی ہوئی اس کے دل تک پہنچ جائے گی اور وہ سب کچھ جلا ڈالے گی جو اس کے دل میں ہے۔ پیار کی وہ ساری ادھ کھلی کلیاں بھسم ہوجائیں گی جو بُرے موسموں سے کسی اچھے موسم کی منتظر ہیں۔ بہار کے آنے سے پیشتر ہی ایک دائمی خزاں دل کی دنیا کو ڈھانپ لے گی۔ پھر اس کے ذہن میں اپنے معصوم بہن بھائیوں کا خیال آیا۔ اپنی بیمار بوڑھی والدہ اور گھر کے واحد کفیل کا خیال آیا جو پولیس تشدد کا شکار ہوا تھا اور اب لاچار ہو کر اسپتال میں پڑا تھا اور پھر اس چھت کا خیال بھی آیا جو ان کے سروں سے سرکنا چاہ رہی تھی۔ ایسے میں وہی بھیانک تصوراتی آواز اس کی سماعت کو دہلانے لگی جو آج کل اکثرون کے اجالے اور رات کے سناٹے میں اسے سنائی دیتی تھی۔ یہ بلڈوزروں کی آواز تھی اور محکمے کے ان اہلکاروں کی آواز تھی جو اس مکان کے لئے وہی کردار ادا کرسکتے تھے جو ایک جیتے جاگتے جسم کے لئے عزرائیل ادا کرتا ہے۔

اس آواز نے کئی ہفتوں سے اس کا چین حرام کر رکھا تھا۔

سویرا نے اپنا لرزاں ہاتھ آگے بڑھایا اور تپائی پر سے دونوں بالیاں اٹھالیں۔

ثاقب بشیر کی باچھیں کھل گئیں۔ چند منٹ پہلے وہ گرم چائے کو ناک چڑھا چڑھا کر پی رہا تھا۔ اب اس نے ٹھنڈی چائے کو بھی خوش دلی سے پینا شروع کردیا۔ اس کی خوشی ناقابلِ فہم نہیں تھی۔ اس نے دیکھ لیا تھا کہ مچھلی کانٹا نگل رہی ہے۔

کچھ دیر تک اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد وہ اٹھ گیا۔ بولا۔ "بھئی' بڑا اچھا کھانا تھا اور خاص طور سے بریانی' جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔"

"شکریہ!" سویرا نے کہا۔

وہ معنی خیز لہجے میں بولا۔ "کیا کوئی ایسی صورت بن سکتی ہے کہ ایسی بریانی کھانے کو ملتی رہے؟"

سویرا دکھ آمیز شرم کے سبب کوئی جواب نہ دے سکی اور چائے کے برتن سمیٹنے لگی۔

وہ بولا۔ "اچھا' اس بارے میں پھر بات کریں گے۔"

دو ہی دن بعد سویرا کی امی نے اسے کمرے میں بلایا اور دروازہ بند کرلیا۔ بچے اسکول جاچکے تھے۔ پنکی کی چھٹی تھی تاہم وہ چھت پر تھی اور دھوپ میں سوئی ہوئی تھی۔ والدہ کے انداز نے سویرا کو سمجھا دیا کہ کوئی اہم بات ہے۔

ایک لمبی تمہید باندھنے کے بعد سویرا کی امی نے کہا۔ "کل جب تم بھائی کے پاس اسپتال میں تھیں' ثاقب آیا تھا۔ ڈیڑھ دو گھنٹے بیٹھا رہا.......... اس نے تمہارے.......... رشتے کی بات کی ہے۔"

سویرا کے پاؤں کے ناخنوں سے سر کے بالوں تک چیونٹیاں سی رینگ گئیں۔ تاہم وہ انجان بنتے ہوئے بولی۔ "کیا کہہ رہے تھے؟"

"وہ تم سے شادی کرنا چاہتا ہے اور اس کا خیال ہے کہ.......... تم بھی انکار نہیں کروگی۔"

سویرا نے ایک گہری سانس لی۔ آنکھوں کو پھیلا کر کوشش کی کہ پتلیوں میں تیرتی

ہوئی نمی اجاگر نہ ہو جائے۔ پھر ٹھہری ہوئی آواز میں بولی۔ "امی! آپ کا کیا خیال ہے؟"

وہ چند سیکنڈ سویرا کو گھورتی رہیں پھر بولی۔ "میرا کوئی خیال نہیں بیٹا!"

"تو پھر مجھے یہ شادی منظور ہے امی!" سویرا نے ایک دم کہا۔ "میں چاہتی ہوں امی کہ ہم سب خوش رہیں اور مجھے لگتا ہے کہ اس وقت ہم سب کی خوشیاں اسی صورت میں ہمیں مل سکتی ہیں کہ میں ثاقب صاحب سے شادی کرلوں۔"

"اور..........احسن..........؟" امی کی آواز جیسے کہیں بہت دور سے آئی۔

"اس کا کیا ہے امی! کچھ دن رو دھو کر خود ہی ٹھیک ہو جائے گا۔" سویرا کی آواز بھرا گئی۔

کمرے کی نیم تیرگی میں ماں بیٹی آمنے سامنے چند لمحے ساکت بیٹھی رہیں۔ دونوں اس دکھ کو سمجھ رہی تھیں جو ایک پہاڑ کی طرح ان پر آگرا تھا مگر وہ اس پہاڑ کو نظر انداز کررہی تھیں۔ "میری بچی!" یکایک امی اٹھیں اور سسک کر سویرا کو گلے سے لگالیا۔

سویرا کچھ دیر تک تو خود کو سنبھالنے کی کوشش کرتی رہی پھر وہ بھی پھوٹ پھوٹ کر رودی۔ وہ جانتی تھی کہ آنے والے دنوں میں اسے بہت رونا آئے گا مگر وہ رو نہیں پائے گی۔ شاید اس لئے اس نے سوچا تھا کہ اس کمرے میں اپنی ماں کے سینے میں سر چھپا کر جی بھر کر آنسو بہالے۔

☆=========☆==========☆

وہ بڑے اداس دن تھے۔ سردی بتدریج رخصت ہو رہی تھی۔ ہوا میں ہلکی سی حرارت آگئی تھی۔ یہ بہار کا موسم تھا۔ مگر اس بہار کی تاثیر خزاں کی تھی۔ اب بھی وہی شام جام نگر میں اترتی تھی۔ وہ اسی طرح چھت پر جاتی تھی' چمنیوں سے دھواں نکلتا تھا' گلیوں میں بچے آنکھ مچولی کھیلتے تھے۔ آسمان پر پتنگیں ڈولتی تھیں۔ مگر یہ سب کچھ جیسے سویرا سے بہت دور چلا گیا تھا اور ابھی مزید دور جا رہا تھا۔ اسے محسوس ہوتا تھا کہ وہ اپنی بستی میں اپنے ہی گھر میں پردیسی ہوگئی ہے۔ اب سے کچھ ہی عرصے بعد اسے دلہن بن کر ماڈل ٹاؤن چلے جانا تھا۔ وہ امراء کی بستی تھی۔ صاف ستھری' کشادہ' سلیقے سے بنی ہوئی اور سلیقے سے برتی جانے والی لیکن جس بستی میں سویرا نے زندگی کے بیس سال گزارے تھے' وہ سویرا کو ہر پہلو سے عزیز تھی۔ اس بستی کی بے ترتیبی' اس کا ٹیڑھا پن' اس کا شور' گلی کوچوں کا رہن سہن سب کچھ اپنے اندر ایک ایسا حسن سمیٹے ہوئے تھا جس کے حصار سے نکلنا کم از کم سویرا کے لئے تو ممکن نہیں تھا۔ احسن کی جدائی کے خیال کے بعد جو خیال سویرا کو سب سے زیادہ تڑپاتا تھا' وہ اس بستی سے جدائی کا تھا۔ سویرا کا دل چاہتا تھا۔ وہ اس بستی سے لپٹ جائے۔ بستی کی ٹیڑھی میڑھی بانہوں میں سما جائے۔ بستی کے شانے پر سر رکھ دے اور روتی چلی جائے۔

ثاقب بشیر کے ساتھ سویرا کی شادی کی تاریخ بائیس فروری مقرر ہوئی تھی۔ جوں جوں یہ دن نزدیک آ رہا تھا' سویرا کا دل ہر چیز سے اچاٹ ہوتا چلا جا رہا تھا کہاں وہ ہر وقت گھر کے کام کاج میں جتی رہتی تھی' اب ایک دم اس نے ہر کام سے ہاتھ کھینچ لیا تھا۔ بس خاموش بیٹھی رہتی یا چارپائی پر چادر اوڑھ کر لیٹی رہتی۔ ایک دن پنکی نے چمک کر کہا تھا۔

"بس جی' اب تو آپی مہمان ہیں اور مہمان سے کام کاج تو نہیں کرانا چاہئے نا۔ میں نے

فیصلہ کرلیا ہے' اب میں ایک ماہ کے لئے کالج کا منہ نہیں دیکھوں گی۔ اپنی پیاری آپی کو جی بھر کر آرام کراؤں گی اور ساتھ ساتھ شادی کی تیاری بھی کروں گی۔''

پھر سویرا اور ای کے لاکھ منع کرنے کے باوجود پنکی اپنی مرضی کرکے رہی تھی۔ اس نے ایک طرح سے سویرا کو باندھ کر کمرے میں بٹھا دیا تھا۔ صاف صاف کہہ دیا تھا کہ وہ تنکا پکڑ کر دہرا نہیں کرے گی اور اگر اس نے کچھ کرنا ہی ہے تو پھر اپنی شادی کے کپڑے وغیرہ تیار کرے۔

پنکی نے اپنی طرف سے تو اچھا ہی کیا تھا لیکن وہ خود کو واقعی اپنے گھر میں مہمان سمجھنے لگی تھی۔ بھائیوں کو اوپری نظر سے دیکھتی' در و دیوار پر الوداعی نگاہیں ڈالتی اور کبھی کبھی سب کی نظر بچا کر چپکے سے ان پر ہاتھ بھی پھیر لیتی۔ دل میں ایک بیکراں درد لہریں لیتا محسوس ہوتا تھا۔ کبھی کسی پُرسوز گیت کی لے کانوں میں گونج جاتی۔ ساڈا چڑیاں دا چنبہ اے' بابل اساں اڈ جاناں۔

شام اداس ترین ہوتی تھی۔ وہ چارپائی پر لیٹ کر سرخ کناروں والی بدلیوں کو دیکھتی رہتی۔ ہوا اس کے کنوارے بدن کو چھوتی تو اسے احسن کی یاد آجاتی۔ وہ سوچتی' وہ اسی شہر' اسی بستی میں موجود ہے۔ اسی شام کے سائے تلے' اسی ہوا میں سانس لے رہا ہے۔ مگر اس سے کتنی دور ہے اور ابھی مزید کتنی دور جا رہا ہے۔

احسن کو یہ بات تو ایک ماہ پہلے ہی معلوم ہوگئی تھی کہ ثاقب بشیر ایک بار پھر سویرا اور اس کے گھرانے پر مہربان ہوگیا ہے اور ''رحمت کا جو فرشتہ'' چپکے سے توقیر کے آپریشن کا خرچہ دے گیا تھا' وہ بھی ثاقب ہی تھا۔ بہرحال اس پر یہ بات بھی کھل گئی تھی کہ سویرا نے ثاقب بشیر سے شادی پر رضامندی ظاہر کردی ہے۔ اس دن کے بعد احسن نے سویرا کو شکل ہی نہیں دکھائی تھی۔ اگرچہ سویرا نے احسن کی شکل نہیں دیکھی تھی تاہم وہ بن دیکھے ہی جانتی تھی کہ اس کی شکل کیسی ہوگی۔ بکھرے بال' سرخ متورم آنکھیں بڑھی ہوئی شیو اور تن بدن میں آگ کا ایک سمندر ہلکورے لیتا ہوا۔ وہ احسن سے دور بیٹھ کر بھی اس کے غم کی شدت کو محسوس کرسکتی تھی۔ بالکل جیسے دہکتا تندور دور سے بھی اپنی موجودگی کا احساس دلاتا رہتا ہے۔ خود اس کا اپنا بھی تو برا حال تھا۔ جان ایک ململ کے

کپڑے سی تھی اور کوئی اسے کانٹوں بھری جھاڑی پر ڈال کر جھٹکوں سے کھینچ رہا تھا۔ وہ اپنے اندر ہی تار تار ہو رہی تھی۔ مگر وہ جانتی تھی کہ وہ بہت سخت جان ہے۔ زمانے اور حالات کی بے رحمی نے اس کو بہت ڈھیٹ بنا دیا تھا۔ مگر احسن تو ایسا نہیں تھا۔ بھوک کی طرح اس سے غم بھی سہا نہیں جاتا تھا۔ وہ اس کے بارے میں سوچتی تھی تو وہ حسبِ معمول اسے ایک بچے کی طرح لگتا تھا۔ ایک ایسا بچہ جو اپنی کوئی عزیز ترین شے چھن جانے کے خیال سے ڈر سہم گیا ہو۔ سویرا جانتی تھی' احسن کے لئے غم کا یہ پہاڑ سر کرنا آسان نہیں ہوگا۔ وہ نازک دل تھا' شاید اسی لئے کہ وہ رومان پسند تھا۔ پھولوں' پرندوں' کتابوں اور رنگوں غرض ہر چیز میں وہ کوئی نہ کوئی رومانیت تلاش کر ہی لیتا تھا۔ کبھی کبھی تو سویرا کو لگتا تھا کہ وہ جو ہر وقت لاٹریوں اور انعامی بانڈوں کے چکر میں پڑا رہتا ہے' تو یہ بھی ایک طرح کی رومانیت ہی ہے۔ ایک انہونی کو دیکھنے کی رومانیت۔

ثاقب کی مہربانیوں کے طفیل شیخ زید اسپتال میں توقیر کی کمر کی متاثرہ ہڈی کا آپریشن کامیابی سے ہوگیا تھا۔ تاہم ڈاکٹر کا کہنا تھا کہ شاید ابھی معمولی سرجری کی ضرورت پیش آئے۔ ثاقب بشیر توقیر کی جلد صحت یابی کے لئے سخت تگ و دو کر رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ شادی کی تاریخ تب ہی برقرار رہ پائے گی جب توقیر صحت یاب ہو کر گھر آجائے گا۔

شادی سے دس پندرہ روز پہلے ثاقب کے گھر والے سویرا کے لئے شادی کا سرخ جوڑا لے کر آئے۔ اس دن سویرا اپنے گھر کے خستہ حال اسٹور روم میں گھس گئی اور دھاڑیں مار مار کر روئی۔ رونے سے دل کا بوجھ ہلکا ہو جاتا ہے لیکن سویرا کا نہیں ہوتا تھا۔ وہ سوچتی تھی وہ اپنے بہن بھائیوں کے لئے قربانی دے رہی ہے اور اپنی مرضی سے دے رہی ہے' پھر وہ روتی کیوں ہے؟ کیوں سب کچھ خاموشی سے نہیں جھیل جاتی۔ پھر اس کے دل میں خیال آتا تھا کہ شاید ایسا اس لئے ہے کہ وہ احسن کی گناہ گار ہے۔ اس سے معافی مانگے بغیر اس سے رخصت ہو رہی ہے' اس روز اسٹور روم میں گھس کر زار و قطار روتے ہوئے سویرا نے سوچا کہ وہ ایک بار احسن سے ملے گی۔

☆========☆========☆

وہ ویگن سے اتری اور اکیلی ہی ایک طویل سڑک پر چلنے لگی۔ یہ سڑک باغ جناح

کے شمالی گیٹ کی طرف جا رہی تھی۔ باغ جناح کے کیفے ٹیریا میں احسن اس کا انتظار کر رہا تھا۔ ہاں' یہی وہ شاہراہ قائداعظم تھی جس کے بارے میں احسن نے یہ خواب دیکھا تھا کہ وہ کسی روز اپنی پھٹیچر موٹرسائیکل پر سوار ہو کر یہاں سے گزرے گا........ سویرا اس کے عقب میں بیٹھی ہوگی........ اب وہ موٹر سائیکل تھی' نہ وہ سویرا تھی اور نہ وقت ان کے ہاتھ رہا تھا۔

شام کے ڈھلتے سایوں میں وہ دونوں باغ جناح کے ایک ویران کنج میں دیر تک ایک دوسرے کے سامنے بیٹھے رہے۔ دونوں کی آنکھوں میں بار بار آنسو تیر جاتے تھے۔ احسن نے بوجھل آواز میں کہا۔ "کیا کسی طرح مجھے تھوڑی سی مہلت نہیں مل سکتی۔ بس سات آٹھ ماہ' میں تمہاری قسم کھاتا ہوں سویرا۔ میں خود کو مار ڈالوں گا یا پھر اپنے پاؤں پر کھڑا ہو جاؤں گا۔ میں تمہاری اور توقیر بھائی کی ساری پریشانیاں دور کر دوں گا۔ بس تم انکار کر دو اس شادی سے۔"

"میں بری طرح جکڑی ہوئی ہوں احسن! سمجھو کہ اپنی جگہ سے ہل بھی نہیں سکتی ہوں۔ تم سات آٹھ ماہ کی بات کر رہے ہو' میرے حالات تو مجھے سات آٹھ دن کی مہلت بھی نہیں دے رہے۔ میری بیمار ماں اور بھائیوں کے سر سے چھت کسی بھی وقت سرک سکتی ہے۔ اب توقیر بھائی بھی کچھ کرنے کے قابل نہیں بلکہ ان کے لئے کچھ کئے جانے کی ضرورت ہے۔ وہ بمشکل چل پھر سکتے ہیں۔ علاج پر خرچ علیحدہ ہو رہا ہے........ احسن! میں جانتی ہوں' میں نے تمہیں بہت بڑا دکھ دیا ہے۔ زندگی میں تم سے کچھ اور نہیں مانگا۔ بس اس دکھ کے لئے تم سے معافی مانگتی ہوں' مجھے مایوس نہ کرنا۔"

"بات معافی کی نہیں سویرا' گناہ گار تو میں بھی ہوں۔ میں کیوں اس قابل نہ ہو سکا کہ تمہیں تمہارے جنجالوں سے نکال لیتا۔ ہاں سویرا! بات معافی کی نہیں' بات تو یہ سوچنے کی ہے کہ کیا ہم ایک دوسرے کے بغیر جی سکیں گے؟"

"جینا پڑے گا احسن! اس کے بغیر چارہ نہیں۔ ہم اکیلے نہیں ہیں۔ ہمارے ساتھ کچھ لوگ وابستہ ہیں۔ ان سب کی بہتری کے لئے ہمیں یہ زہر کا گھونٹ بھرنا پڑے گا۔ آؤ........ آج اپنی غریب محبت کو مار کر یہیں دفن کر دیں۔" سویرا کی آنکھیں چھلک

گئیں۔

احسن نے ایک طویل آہ بھر کر کہا۔ "تم دفن کر دو' میں تو نہیں کروں گا۔"

"تم بھی کر دو احسن' تم بھی........"

"میں تمہارے بغیر نہیں رہ پاؤں گا۔"

"صفر میں صفر جمع مت کرو........ ابھی تمہیں پڑھنا ہے اور آگے جانا ہے' ہو سکتا ہے تمہاری زندگی میں کوئی بہتر لڑکی آ جائے؟"

"غالباً بہتر سے تمہاری مراد امیر لڑکی ہے۔ مگر صفر تو سو میں جمع ہو کر بھی صفر ہی رہے گا۔" اس کے لبوں پر زہریلی مسکراہٹ تھی۔ وہ چند لمحوں تک اشک بار نظروں سے سویرا کو گھورتا رہا پھر بولا۔ "ویسے یہ اچھی بات ہے کہ تمہیں ابھی سے ہندسوں میں باتیں کرنا آ گئی ہیں۔ ثاقب کے گھر جا کر ہندسوں سے تمہارا بہت واسطہ پڑے گا۔"

وہ رونے کے سوا کچھ نہیں کر سکی تھی........ وہ دیر تک باتیں کرتے رہے تھے۔ شام ہو گئی' اندھیرا چھانے لگا۔ کافی وقت ہو گیا تھا لیکن یہ آخری ملاقات تھی۔ آخری ملاقات میں مجرموں کو وقت کی چھوٹ تو ملتی ہی ہے۔

احسن کا غم اس کے لفظوں میں سرایت کر گیا تھا۔ ایک ایک لفظ تیر کی طرح سویرا کے سینے میں لگ رہا تھا۔ وہ بے حال ہو رہی تھی۔ شام کے ہر دم گہرے ہوتے اندھیرے میں یہ روتا بلکتا شکوہ کناں احسن اسے ایک بچے کی طرح لگا۔ اس کا دل چاہا' وہ اسے اپنی بانہوں میں چھپا لے۔ اس کے کانوں میں محبت اور سکون کا کوئی ایسا گیت گائے کہ وہ روتے روتے سو جائے۔ وہ اس کی تربتر آنکھوں کو چومے اور پھر آہستگی سے اسے شبنم آلود گھاس پر لٹا کر چلی جائے۔

لیکن وہ صرف سوچ سکتی تھی' کر کچھ نہیں سکتی تھی۔ پھر اس جگر پاش گفتگو کے دوران میں ایک مرحلہ ایسا آ گیا کہ سویرا ٹوٹ پھوٹ گئی۔ اس کے دماغ میں دراڑیں پڑ گئیں اور وہ بکھرنے لگی۔ احسن نے کہا تھا۔ "تمہاری اس قربانی کے بغیر بھی تمہارے گھر والے انشاء اللہ جینے کا کوئی نہ کوئی وسیلہ کر ہی لیں گے لیکن میں شاید زندگی سے ناتا برقرار نہ رکھ سکوں گا۔ تم مجھے مار کر جا رہی ہو سویرا' سچ مچ میرا قتل کر رہی ہو۔"

ان الفاظ نے سویرا کے دل و دماغ میں تہلکہ مچا دیا' قریب تھا کہ غم کی غیر معمولی حدت میں اس کے آہنی ارادے پگھل جاتے یا اس کی زبان سے کوئی ایسی بات نکل جاتی جو اسے ذہنی اذیت کے ایک مہیب بھنور میں گرا دیتی.......... قدرت نے اس کے لئے آسانی پیدا کردی۔ خستہ لباس والے دو غریب صورت لڑکے اس تنہا گوشے میں آکر ایک بینچ پر بیٹھ گئے۔ وہ نشئی لگتے تھے اور سگریٹ پھونک رہے تھے۔ انہیں دیکھ کر احسن چونک گیا۔ سویرا بھی ان لڑکوں کو جانتی تھی۔ وہ جام نگر میں احسن کے پڑوسی تھے۔ وہ موٹر میکنک تھے اور احسن کی پھپھو کی موٹر سائیکل اکثر ان کے پاس کھڑی نظر آیا کرتی تھی۔ لڑکوں کا رخ دوسری طرف تھا۔ انہوں نے ابھی احسن کو نہیں دیکھا تھا لیکن کسی بھی وقت دیکھ سکتے تھے۔

احسن اور سویرا اٹھ کھڑے ہوئے۔ سویرا کا سارا وجود لرز رہا تھا۔ اس نے آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا۔ "احسن! ہمیں اپنے آپ کو سنبھالنا پڑے گا' پلیز احسن!"

"میں نہیں سنبھلوں گا اور مجھے سنبھلنا بھی نہیں۔" وہ عجیب لہجے میں بولا تھا۔

وہ خاموش رہی' پھر روتے ہوئے بولی۔ "اچھا' خدا حافظ نہیں کہو گے؟"

"نہیں کہوں گا' کبھی نہیں.......... زندگی کی آخری سانس تک نہیں.......... اور تمہیں کبھی آواز نہیں دوں گا۔"

اور وہ چلا گیا تھا۔

ٹھیک دس روز بعد سویرا کی شادی ثاقب بشیر سے ہوگئی تھی۔ یہ ایک مختصر سی تقریب تھی جس میں سویرا کے اہل خانہ کے علاوہ بمشکل دس بارہ افراد نے شرکت کی تھی۔ بارات تین کاروں پر آئی تھی۔ نکاح کے بعد کھانا ہوا تھا۔ سویرا نے امی اور پنکی کو گلے سے لگا کر دیر تک آنسو بہائے تھے۔ پھر اس نے گود میں بٹھا کر ایک ایک بچے کا منہ چوما تھا۔ نو سالہ عدنان' سات سالہ دانش' چھ سالہ زلفی.......... زلفی تو اس سے لپٹ ہی گیا تھا۔ اس کی گود سے اترتا ہی نہیں تھا۔ دوسرے بہن بھائیوں کی طرح وہ خود نہیں رویا تھا لیکن اس نے سویرا کو رلا رلا کر ہلکان کر دیا تھا۔ سویرا کے ساتھ بہن بھائیوں کا ملاپ دیکھ کر بالکل یہی لگ رہا تھا جیسے ایک ماں اپنے بچوں سے جدا ہو رہی ہے اور وہ ماں تھی

بھی.......... بلکہ بھائی اپنی بہنوں کو ڈولی میں بٹھاتے ہیں مگر توقیر اس قابل کہاں تھا۔ وہ اسپتال سے گھر آگیا تھا مگر بستر پر ہی تھا۔ عورتوں کے کہنے پر نو سالہ عدنان نے اپنی پیاری آپی کا بازو تھاما تھا اور اسے پھولوں سے لدی ہوئی خیبر گاڑی میں بٹھا دیا تھا۔ جس کے بغیر وہ ایک پل نہیں رہ سکتے تھے' اسے اپنے ہاتھوں سے ہمیشہ کے لئے وداع کردیا تھا۔

☆=========☆=========☆

ماڈل ٹاؤن کی وسیع کوٹھی میں نوکروں چاکروں کے درمیان سویرا کی نئی زندگی کا آغاز معمول کے مطابق ہی ہوا۔ شادی کے فوراً بعد ثاقب بشیر سویرا کو لے کر مری چلا گیا۔ وہاں ان کا پروگرام دو ہفتے رہنے کا تھا مگر تیسرے چوتھے روز ہی ثاقب کو فون کال آگئی اور اسے دفتری کام کے سلسلے میں فوراً لاہور آنا پڑ گیا۔ گھر میں سویرا کو تمام سہولیات میسر تھیں۔ ثاقب کا چھوٹا بھائی عارف اور اس کی بیوی اپنے دو بچوں کے ساتھ اوپری حصے میں رہتے تھے۔ عارف کی بیوی سعدیہ نارمل مزاج اور نارمل شکل و صورت کی عورت تھی۔ بے تکلفی سے باتیں کرتی تھی' ہاں عارف ذرا مختلف مزاج کا تھا۔ وہ کچھ پڑھا لکھا تھا اور بے حد خاموش طبع تھا۔ وہ ان لوگوں میں سے تھا جن کو لطیفہ سنا کر بتانا پڑتا ہے کہ اب ہنسنا بھی ہے۔

شادی کو پندرہ بیس روز ہوئے تھے جب ثاقب نے پہلی بار سویرا سے ذرا تلخ لہجے میں بات کی۔ ہفتے کی شام تھی۔ سویرا کو ثاقب کے ساتھ امی کی طرف جانا تھا۔ ننھے زلفی کی سالگرہ تھی۔ اس نے زلفی کے لئے تحفہ خریدا تھا۔ امی کی ایک دوا جو کسی عام دکان سے نہیں ملی تھی۔ سویرا نے ثاقب سے کہہ کر فضل دین سنز سے منگوائی تھی۔ وہ یہ دوا بھی امی کو پہنچانا چاہتی تھی۔ ثاقب دفتر سے لیٹ آیا۔ اس وقت آٹھ بج چکے تھے۔ سویرا نے پنکی سے کہا تھا کہ وہ ساڑھے سات تک پہنچ جائیں گے۔ آتے ہی ثاقب کا موڈ نہانے کا بن گیا۔

سویرا نے ذرا ٹھنک کر کہا۔ "کیا کرتے ہیں' اتنی دیر سے آئے ہیں۔ اب نہانے گھس رہے ہیں۔"

وہ عجیب لہجے میں بولا۔ "ہم بدبودار بندے ہیں بھئی! نہائیں دھوئیں گے نہیں تو تم

گاڑی میں ہمارے ساتھ بیٹھنے سے انکار کردوگی۔"

سویرا کا جسم کانپ کر رہ گیا۔ کتنی سہولت سے کتنی کاری ضرب لگائی تھی ثاقب نے۔ وہ کوشش کے باوجود وہاں کھڑی نہ رہ سکی۔ کمرے میں گھس گئی اور دیر تک روتی رہی۔ اس نے امی کے گھر جانے کا پروگرام بھی کینسل کردیا۔ ثاقب نے ایک بار بھی اسے منانے کی کوشش نہیں کی۔ وہ تین چار روز چپ چپ رہی' پھر خود ہی ٹھیک ہوگئی..........

دونوں ایک ہی بستر پر دور دور لیٹے ہوئے تھے۔ سویرا نے ہولے سے سرک کر اس کا ہاتھ تھاما اور اس کے گلے سے لگ گئی۔

صلح صفائی کے بعد اگلے روز وہ ثاقب کے ساتھ امی کے گھر گئی۔ وہیں بیٹھے بیٹھے ثاقب نے پروگرام بنالیا کہ وہ پھر سے مری جائیں گے اور اپنا ادھورا ہنی مون پورا کریں گے۔ بات ننھے زلفی کے کان پر پڑگئی۔ وہ بری طرح ضد کرنے لگا کہ وہ بھی ساتھ جائے گا۔ سویرا اور اس کی امی نے بہتیرا سمجھانے کی کوشش کی مگر وہ رو رو کر برا حال کرنے لگا۔ سویرا نے سوالیہ نظر سے ثاقب کی طرف دیکھا۔ اس کا موڈ اچھا تھا۔ وہ بولا۔ "ٹھیک ہے' چھوٹے سالا جی ساتھ چلیں گے۔"

سویرا نے کہا۔ "اگر زلفی جائے گا تو پھر میں ادھر سے ٹیپو کو بھی لے جاؤں گی۔"

ٹیپو' ثاقب کے بھتیجے کا نام تھا وہ زلفی کا ہم عمر تھا۔

ثاقب نے کہا۔ "ٹھیک ہے۔ جو ہماری سرکار کے جی میں آئے' کریں۔"

امی تھوڑی دیر کے لئے باہر گئیں تو ثاقب اسے گھورتے ہوئے بولا۔ "ان بچو نگڑوں کو ساتھ لے جاؤ گی تو ہمارا کیا بنے گا؟"

"آپ ذرا شریف بن کر رہیں گے۔" وہ سرخ ہو کر بولی۔

اسی دوران میں پنکی نے ساتھ والے کمرے سے اسے آواز دی۔ وہ وہاں گئی تو پنکی دکھی لہجے میں اسے احسن کے بارے میں بتانے لگی۔ اس کی باتوں سے معلوم ہوا کہ احسن سخت بیمار ہے' ہڈیاں نکل آئی ہیں۔ پنکی نے بتایا کہ وہ اپنے موٹر میکنک دوستوں کے پاس بیٹھا رہتا ہے۔ وہ دونوں نشئی ہیں اور اسپرٹ وغیرہ پیتے ہیں۔ سنا ہے کہ احسن بھی اسپرٹ پینے لگا ہے۔ یہ باتیں سن کر سویرا کا دم گھٹنے لگا۔ اس نے کہا۔ "پلیز پنکی! مجھ سے اس

بارے میں کوئی بات نہ کرو' مجھے بھول جانے دو.......... سب کچھ بھول جانے دو۔"

گھر واپس جا کر رات کو ہی ان لوگوں نے مری کی تیاری کرلی۔ سویرا ضروری سامان پیک کررہی تھی' جب دیور صاحب آگئے۔ "کہاں کی تیاریاں ہیں؟" وہ مخصوص سنجیدہ لہجے میں بولا۔

"مری جارہے ہیں۔" سویرا نے ہنس کر کہا۔

"اور یہ چھوٹے صاحب!" عارف نے زلفی کی طرف اشارہ کیا۔

"یہ بھی ہمارے ساتھ جارہے ہیں اور ٹیپو بھی۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہی عارف کہ ٹیپو ہمارے ساتھ جائے گا۔ تین چار روز کی تو بات ہے۔"

عارف عجیب انداز میں اسے گھورے چلا جارہا تھا۔ اس کے انداز نے سویرا کو گڑبڑا دیا۔ "کیا بات ہے عارف؟" وہ بولی۔

"دیکھ رہا ہوں' عورت اپنے چہرے پر کیسے کیسے خول چڑھا لیتی ہے۔"

"میں سمجھی نہیں۔"

"میں سمجھا نہیں سکتا بلکہ زمانے گزر گئے ہیں کوئی کسی کو سمجھا نہیں سکا۔ میں جب تم جیسی کسی عورت کو مسکراتے دیکھتا ہوں' میرا دل چاہتا ہے کہ میرے ہاتھ میں ایک ہتھوڑا ہو' میں یہ ہتھوڑا مار کر ہنسنے والی کے سارے دانت اس کے حلق میں گرا دوں۔"

"عا.......... عارف! یہ کیسی باتیں کررہے ہو تم۔ میں تمہیں.......... کیسی عورت لگتی ہوں؟"

"بالکل اصلی اور خالص.......... ٹریڈ مارکہ منافق عورت! جو پیار کہیں اور کرتی ہے اور شادی کہیں اور.......... اپنی اس بددیانتی کو اکثر قربانی کا نام دیتی ہے۔ حالانکہ قربان وہ دو بندوں کو کرتی ہے۔ ایک وہ جس سے یارانہ گانٹھ کر بے وفائی کی اور ایک وہ جس سے رشتہ گانٹھ کر دھوکا دیا۔"

سویرا کی آنکھیں چھلک پڑیں۔ "عارف! تم ہوش میں تو ہو؟"

"بالکل ہوش میں ہوں اور شاید یہ سن کر تمہیں بھی ہوش آجائے کہ تمہارے تیر

نظر کے شکار اور تمہاری بے وفائی کے ڈسے ہوئے احسن کو میں اچھی طرح جانتا ہوں۔"

"کیا کہہ رہے ہو تم؟"

"جھوٹ نہیں بول رہا.......... کیونکہ جھوٹ سے نفرت ہے مجھے۔ یہی وجہ ہے کہ جب میں تمہیں اپنے اس گھر میں ہنستے مسکراتے دیکھتا ہوں تو میرا خون کھولنے لگتا ہے۔"

"تت.......... تم اگر احسن کو جانتے بھی ہو تو میرا اس سے کیا تعلق اور تم میرے ساتھ ایسی الٹی سیدھی باتیں کیوں کر رہے ہو؟"

"اس لئے کر رہا ہوں کہ تمہاری خوشی اور تمہاری یہ اٹھکیلیاں مجھ سے دیکھی نہیں جاتیں۔ ایک طرف وہ تمہارا ڈسا ہوا احسن ہے' وہ زندگی اور موت کے درمیان لٹکا ہوا ہے۔ سگریٹ پھونک پھونک کر اور اسپرٹ پی پی کر اس نے اپنا سینہ چیر ڈالا ہے۔ وہ ہر پل تمہارا نام لے رہا ہے۔ ہر گھڑی تمہاری راہ دیکھ رہا ہے اور ادھر تم اپنی دنیا میں مگن' بھائی جان کے ساتھ چہلیں کرتی پھر رہی ہو۔"

شاید عارف اور بھی کچھ کہتا۔ شاید سویرا کو کچھ اور زہریلے تیر اپنے سینے پر سہنے پڑتے مگر اسی دوران میں ثاقب کی گاڑی کا ہارن سنائی دیا اور عارف پاؤں پٹختا ہوا سیڑھیوں کی طرف چلا گیا.......... عارف کی باتیں سن کر سویرا پانی پانی ہوگئی تھی۔ اس نے سوچا تو واقعی اسے یوں لگا کہ وہ حد درجہ بے حس اور ظالم ہوگئی ہے۔ وہ ازدواجی زندگی کی ایک ایسی عمارت کھڑی کر رہی ہے' جس کی بنیادوں میں مسلسل احسن کے آنسوؤں کا پانی جذب ہو رہا ہے۔ اس کا دل بہت ویران ہوگیا تھا۔ وہ سوچنے لگی کہ مری جانے کا پروگرام کینسل کردے لیکن یہ پروگرام اس کا تو نہیں تھا' ثاقب کا تھا اور وہ اس کے پروگراموں اور اس کی خواہشوں میں دخل اندازی کرنے کی جرأت نہیں کرسکتی تھی۔ وہ لوگ مری گئے لیکن تنہا.......... چونکہ ٹیپو ساتھ نہیں گیا تھا لہٰذا سویرا نے روتے دھوتے زلفی کو بھی زبردستی گھر واپس بھیج دیا۔

مری میں انہوں نے پانچ چھ روز قیام کیا۔ اس دوران میں زلفی کا بھیگا ہوا چہرہ سویرا کے تصور میں گھومتا رہا۔ سویرا کے ساتھ مری جانے پر وہ کتنا خوش تھا۔ ایک دم اس کے خوابوں کا محل مسمار ہوگیا تھا۔ مری میں اس کا دل بجھا رہا مگر ثاقب کی خوشی کی خاطر اس

نے ایک لمحے کے لئے بھی اپنے چہرے پر غم کا سایہ نہیں پڑنے دیا۔ ثاقب کے ساتھ شادی ہونے کے بعد یہ حقیقت آہستہ آہستہ اس پر کھلنے لگی تھی کہ عورت کو اپنی خوشی اور مسکراہٹ، ہی قربان نہیں کرنا پڑتی' اکثر اپنے آنسو بھی قربان کرنے پڑتے ہیں۔ وہ اپنے بچھڑے ہوؤں کے لئے دل کھول کر رونا چاہتی تھی مگر رو نہیں سکتی تھی۔ اس کی آنکھیں اپنی تھیں لیکن ان پر حق کسی اور کا تھا اور اگر وہ حق دار ان آنکھوں کو سرخ اور متورم دیکھتا تو فوراً پوچھتا کہ وہ کیوں روتی رہی ہے' کس کے لئے روتی رہی ہے؟ لہٰذا وہ سمجھ گئی تھی کہ اکثر اسے اپنے آنسو بھی قربان کرنے پڑیں گے.......... اور صرف آنسو ہی نہیں اپنی خاموشی بھی قربان کرنی پڑے گی۔

ایک دن پنڈی پوائنٹ پر چہل قدمی کرتے ہوئے ثاقب نے اسے زور سے ٹھوکا دیا۔ "یہ ایک دم کہاں کھو جاتی ہو تم؟ میں باتیں کرتا رہتا ہوں تم ہوں ہاں کرتی رہتی ہو۔"

"جج.......... جی.......... ایسی تو کوئی بات نہیں۔ میں سن رہی تھی آپ کی بات۔"

"بالکل غلط کہہ رہی ہو.......... میرا خیال ہے کہ تمہارے دماغ میں ابھی تک زلفی گھسا ہوا ہے۔ اگر میرے ساتھ رہ کر بھی اس کے ساتھ ہی رہنا تھا تو پھر اسے لے آنا تھا ساتھ۔"

وہ ساری شام سویرا نے اپنی صفائی پیش کرتے ہوئے ہی گزار دی۔ وہ محسوس کر رہی تھی کہ دن بدن ثاقب کے دل میں یہ خیال جڑ پکڑ رہا ہے کہ سویرا ہر وقت اپنے اہل خانہ کے بارے میں سوچتی رہتی ہے۔ یہ پریشان کن صورت حال تھی۔ ثاقب کے گھر آکر اس نے مکمل طور پر خود کو ایک بیوی کے روپ میں ڈھالا تھا۔ تھوڑے ہی عرصے میں اس نے وہ سب کچھ سیکھ لیا تھا جو ثاقب کو خوش کرسکتا تھا۔ وہ ہر ممکن طریقے سے اس کے آرام اور خوشی کا خیال رکھتی تھی۔ پھر بھی وہ سب کچھ ہو رہا تھا جس کے اندیشے شادی کے آغاز سے اس کے دل میں تھے۔ سسرال میں یہی سمجھا جا رہا تھا کہ نوجوان اور خوبصورت سویرا نے درمیانی عمر کے ثاقب سے صرف اس لئے شادی کی ہے تاکہ وہ اپنے اہل خانہ کی روٹی روزی کا سامان کرسکے۔ وہ سوچتی تھی کہ اگر شادی کے ابتدائی مہینوں میں یہ صورت

حال پیدا ہوگئی ہے تو آئندہ کیا ہوگا۔

مری سے آئے ہوئے ابھی آٹھ دس روز ہی ہوئے تھے کہ سویرا کی والدہ زیادہ بیمار ہوگئیں۔ پنکی کے امتحان ہو رہے تھے۔ سویرا نے مشکل کے ساتھ ثاقب سے اجازت لی اور والدہ کی دیکھ بھال کی خاطر ایک ماہ کے لئے جام نگر آگئی۔

یہاں پنکی کی زبانی اسے احسن کے بارے میں بہت کچھ معلوم ہوا۔ پنکی نے بتایا کہ وہ بالکل بے کار ہو کر رہ گیا ہے۔ ہر وقت گھر میں پڑا رہتا ہے۔ اس نے ساری کتابیں جلا ڈالی ہیں۔ نشے کے لئے اسپرٹ وغیرہ پیتا ہے۔ فارغ وقت میں اخباروں کے انعامی معمے حل کرتا ہے یا بانڈوں کی پرچیاں خریدتا ہے۔ احسن کی باتیں کرتے ہوئے پنکی رونے لگی' بولی۔ "آپی' مجھ سے تو احسن بھائی کی حالت دیکھی نہیں جاتی۔ آپ کی طرح شاید ہم سب کا بھی یہی خیال تھا کہ وہ کچھ دیر بعد خود کو سنبھال لیں گے لیکن یہاں تو الٹ کام ہو رہا ہے۔"

سویرا نے اپنے آنسو چھپاتے ہوئے کہا۔ "پنکی! یہ سب کچھ مجھے بتانے سے اب کیا فائدہ؟ تم اس طرح میری اذیت میں اضافے کے سوا اور کچھ نہیں کروگی۔ پلیز' مجھ سے ایک وعدہ کرو۔ آئندہ تم احسن کے بارے میں کسی بھی قسم کی مجھ سے کوئی بات نہیں کروگی۔"

"لیکن آپی! آنکھیں بند کرنے سے حالات بدل تو نہیں جاتے۔"

"مجھے اپنے حالات کی فکر کرنی ہے پنکی.......... اور تم سب کے حالات کی فکر کرنی ہے۔ تم جانتی ہو' ثاقب نے کتنی مصیبتوں کو ہماری طرف بڑھنے سے روک رکھا ہے۔ وہ درمیان سے ہٹ جائیں تو خبر نہیں ہمارے ساتھ کیا ہو جائے.......... اور تو اور' شاید یہ چھت بھی سرک جائے تمہارے سروں سے۔"

والدہ کے گھر قیام کے دوران سویرا اکثر گھر کی چھت پر چلی جاتی۔ وہ احسن کے بارے میں نہیں سوچ سکتی تھی لیکن اس بستی کے بارے میں تو سوچ سکتی تھی۔ نہ جانے کیوں احسن اور اس بستی کے متعلق سوچنا اسے ایک ہی جیسا لگتا تھا۔ وہ شام کے ڈھلتے سایوں میں اپنی بستی کا شور سنتی۔ اپنی بستی کی ٹیڑھی میڑھی گلیوں سے باتیں کرتی' جلتی

بجھتی روشنیاں' بجلی کے کھمبے' کھمبوں پر تاروں کے جال' ان جالوں میں اٹکی ہوئی رنگ برنگی پتنگیں' چھتیں' ٹی وی کے ایریل' بالکونیاں' کھڑکیاں' چوبارے۔ یہ سب اس کے اپنے تھے۔ اس کے دوست تھے۔ وہ اس سے بچھڑی سہیلیوں کی طرح ملتے تھے اور اسی بستی کے اس دوسرے کنارے پر احسن رہتا تھا۔

سویرا ایک ماہ کے لئے میکے آئی تھی لیکن ثاقب دس پندرہ روز بعد ہی آکر اسے لے گیا۔ وہ خاموش اور سنجیدہ تھا۔ پتا نہیں عارف نے کیسے کیسے اس کے کان بھرے تھے۔ اس نے سویرا کے اہلِ خانہ سے بھی سیدھے منہ بات نہیں کی۔ گھر جاکر بھی وہ گم صم ہی رہا۔ میکے آتے وقت ثاقب نے اسے ایک ہزار روپے دیئے تھے۔ اس نے ہزار روپے کا پورا پورا حساب لیا اور تفصیل سے پوچھا کہ کہاں کیا خرچ کیا ہے؟ سویرا زلفی کو مری نہیں لے جاسکی تھی۔ اس کی اشک شوئی کے لئے اس نے اسے تین پہیوں والی عام سی سائیکل لے دی تھی۔ ثاقب کو یہ بھی بہت شاق گزرا۔ وہ بولا۔ "لگتا ہے سوتے جاگتے تمہارے ذہن پر زلفی اور دوسرے بھائی ہی سوار رہتے ہیں۔ اردگرد کی کوئی شے تمہیں نظر نہیں آتی۔"

"آپ سب سے زیادہ نظر آتے ہیں۔" سویرا نے مسکرانے کی کوشش کی۔

"غلط کہتی ہو۔"

"کیا ثبوت پیش کروں؟" اس نے اٹھلا کر اپنی بانہیں ثاقب کے گلے میں ڈالنے کی کوشش کی۔

"اچھا چھوڑو.......... پیچھے ہٹو' میں ابھی نہانے جا رہا ہوں۔"

وہ سویرا کو پیچھے ہٹا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ نہانے کی بات بڑے معنی خیز انداز میں کیا کرتا تھا۔ ایک طرح سے وہ اس لفظ کے ذریعے سویرا کو ذہنی اذیت دیتا تھا۔ اسے بتاتا تھا کہ وہ اسے بدبودار قرار دے چکی ہے لیکن اب اپنے مفاد کے لئے اس کی بو کو فراموش کر رہی ہے۔

سویرا ایسے موقعوں پر آنسو بہانے کے سوا اور کچھ نہیں کرپاتی تھی۔ مگر آنسو بھی اسے بڑی احتیاط اور "کفایت شعاری" کے ساتھ بہانے پڑتے تھے۔ جو شخص اس کی

آنکھوں کا اور اس کے سارے جسم کا مالک تھا' وہ پوچھ سکتا تھا کہ یہ آنکھیں سرخ کیوں ہیں؟ کس کے غم میں سرخ ہوئی ہیں؟ بہرحال اس بات سے سویرا کو انکار نہیں تھا کہ اپنے اہلِ خانہ کا خیال اکثر اسے اردگرد سے بیگانہ کردیتا تھا۔ خاص طور سے وہ اپنی چھوٹے بھائیوں کے بارے میں میلوں دور بیٹھ کر بھی سوچتی رہتی تھی۔ عدنان نے کھانا کھایا ہو گایا نہیں؟ دانش کی ٹیچر ناخنوں کے بارے میں بڑی سخت تھیں' نہ جانے پنکی اس کے ناخن کاٹتی تھی یا نہیں؟ زلفی کو رات میں اکثر ایک دفعہ اٹھ کر پیشاب کرانا پڑتا تھا۔ عموماً رات کو سویرا کی آنکھ کھل جاتی اور وہ سوچنے لگتی کہ زلفی کو پیشاب کون کرائے گا۔ وہ ساری رات گیلے بستر پر پڑا رہے گا۔ وہ جو کچھ سوچتی تھی یہ ایک فطری عمل تھا۔ وہ کوشش کے باوجود اتنی جلدی اس عمل سے چھٹکارا نہیں پاسکتی تھی۔

سویرا سسرال میں ثاقب کے ساتھ ساتھ اس کے اہلِ خانہ کو بھی خوش رکھنے کی سر توڑ کوشش کرتی تھی۔ اس کوشش میں وہ کسی حد تک کامیاب بھی ہوئی تھی۔ خاص طور سے بچے اس کے ساتھ بڑے مانوس ہوگئے تھے۔ شاید اپنے چھوٹے بہن بھائیوں کی جدائی کا خلا وہ عارف کے بچوں سے پُر کرنے کی کوشش کررہی تھی۔ بہرحال عارف کے رویے میں قطعاً کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ وہ اس سے خدا واسطے کا بیر رکھتا ہے۔ وہ اب بلا جھجک سویرا کے منہ پر یہ بات کہنے لگا تھا کہ سویرا نے صرف اپنے بھائی کا گھر بھرنے کے لئے شادی کی ہے۔ وہ کسی جاسوس کی طرح سویرا کی ہر ہر حرکت اور جنبش پر نظر رکھتا تھا۔ اگر سویرا کے گھر سے کوئی آجاتا تھا تو عارف کی جان پر بن جاتی تھی' وہ دیکھتا رہتا تھا کہ کہیں سویرا کوئی چیز چھپا کر اپنے میکے تو ارسال نہیں کررہی۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ ثاقب سے زیادہ عارف کو سویرا کی مصروفیات کی فکر رہتی ہے۔

یہ صورت حال دیکھ کر سویرا نے چپکے چپکے فیصلہ کرلیا کہ وہ اب ای کے گھر کم سے کم جائے گی اور بھائیوں سے بھی کہے گی کہ وہ یہاں نہ آیا کریں۔ وہ اپنا گھر خراب کرنا نہیں چاہتی تھی۔ وہ اب اپنے میکے کو بس اپنی نیک دعاؤں میں یاد رکھنا چاہتی تھی یا پھر اس کی اتنی خواہش تھی کہ ابو کی خواہش کے مطابق زلفی کو کسی اچھے اسکول میں داخلہ مل جائے۔ ثاقب نے سویرا سے وعدہ کررکھا تھا کہ وہ زلفی کو داخلہ دلوائے گا اور وہ کہتا تھا کہ

وہ اس کے لئے کوشش بھی کررہا ہے۔ سویرا کے لئے بس یہی بہت تھا۔

ایک روز سویرا کی دیورانی سعدیہ بازار گئی ہوئی تھی۔ سویرا' سعدیہ کے بچوں کو ہوم ورک کرانے میں مصروف تھی۔ ٹیپو نے لطیفہ سنایا۔ بچے کی خوشی کے لئے سویرا کو اس پرانے لطیفے پر بھی ہلکا سا فرمائشی قہقہہ لگانا پڑا۔ اچانک قہقہے کی آواز اس کے حلق میں پھنس کر رہ گئی۔ دروازے میں عارف کھڑا بڑی زہریلی نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اس نے سر اور سینے پر دوپٹا درست کیا اور ایک دم خاموش ہوگئی' عارف نے کہا۔ "ہنسو' اچھلو کودو بلکہ ہو سکے تو ناچو۔ تمہاری پانچوں گھی میں اور سر کڑاہی میں ہے۔ تمہیں کسی سے کیا کوئی مرے یا جئے۔"

"کک......... کیا ہوا ہے؟" سویرا کے منہ سے نکلا۔ عارف کے انداز نے اسے خوف زدہ کردیا تھا۔

عارف بولا۔ "وہی ہوا ہے جو ہونا تھا۔ جس کے گلے پر آدھی تکبیر پھیر کر تڑپتا چھوڑ آئی تھیں' اس نے خودکشی کرلی ہے۔"

"کس.......... کی.......... بات کررہے ہو؟"

"تمہارے سچے عاشق کی.......... احسن اسپتال میں ہے۔ کچھ نہیں کہہ سکتے کہ بچتا بھی ہے یا نہیں۔ اس نے زہر کھالیا ہے۔"

سویرا کی ٹانگوں سے جیسے جان نکل گئی تھی۔ وہ بے دم ہو کر کرسی پر بیٹھ گئی۔ گرد و پیش اس کی نگاہوں میں گھوم رہے تھے۔ عارف زہر خند لہجے میں نہ جانے کیا کچھ کہہ رہا تھا۔ سویرا کی سماعت مفلوج ہوگئی تھی۔ اسے بس عارف کے ہونٹ ہی ہلتے دکھائی دے رہے تھے۔

عارف کی زہریلی مسکراہٹ اور کرخت نظروں سے بچنے کے لئے وہ اپنے کمرے میں گھس گئی اور شام تک سکتے کی سی حالت میں بیٹھی رہی۔ شام کو ثاقب آیا' اسے بھی احسن کے بارے میں اطلاع مل چکی تھی۔ بہرحال اس نے یہ اطلاع سویرا تک مختلف انداز میں پہنچائی۔ اس نے بتایا کہ احسن نے زیادہ مقدار میں خواب آور گولیاں کھالی تھیں جس کے بعد اس کی حالت بگڑ گئی اور اسے اسپتال داخل کرانا پڑ گیا۔

دوسرے روز ثاقب ہی کی زبانی سویرا کو معلوم ہوا کہ اب احسن کی حالت کچھ سنبھل گئی ہے اور اس کے گھر والوں نے اسے سرکاری اسپتال سے ایک نسبتاً اچھے اسپتال میں منتقل کردیا ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ ثاقب کے پاس سویرا کے لئے ایک بری خبر بھی تھی۔ اس نے کہا۔ "سنا ہے کہ احسن کی والدہ کو ہارٹ اٹیک ہوا ہے اور وہ سروسز اسپتال میں ہیں۔"

جس طرح پانی نشیب کا رخ کرتا ہے' اسی طرح بیماریاں بھی غالباً ذوق و شوق سے غریب بستیوں کی طرف جاتی ہیں.......... خالہ کا مہربان چہرہ سویرا کی نگاہوں میں گھوم گیا۔ اکلوتا احسن ان کے دل کی دھڑکن تھا۔ وہ اسے دیکھ دیکھ کر جیتی تھیں' یقیناً اسے دیکھ کر ہی وہ بستر پر گری تھیں۔ خالہ کی بیماری کا سن کر سویرا کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔ اسے لگا کہ اس کے اردگرد جو کچھ بھی ہو رہا ہے' اس کی ذمے دار صرف اور صرف وہ خود ہے۔ جام نگر سے کوئی اسے احسن اور خالہ کی حالت کے بارے میں بتانے کے لئے نہیں آیا تھا۔ نہ ہی وہ وہاں گئی تھی' اگر وہ نہیں گئی تھی تو ثاقب ہی جھوٹے منہ سے جانے کا کہہ دیتا مگر اس کی تو جیسے دلی تمنا پوری ہوگئی تھی۔ شاید وہ خود بھی یہی چاہتا تھا کہ اپنے میکے کے ساتھ سویرا کا تعلق کم سے کم رہ جائے.......... ممکن تھا کہ سویرا از خود اپنے اوپر یہ پابندیاں نہ لگاتی تو ثاقب اپنے اختیار کا استعمال کرتے ہوئے لگا دیتا۔

ساتویں' آٹھویں روز سویرا کی والدہ ڈرتے ڈرتے اس وسیع کوٹھی میں داخل ہوئیں جہاں سویرا' ثاقب کی منکوحہ کی حیثیت سے رہتی تھی۔ خوش قسمتی سے اس وقت ثاقب اور عارف گھر میں موجود نہیں تھے۔ خاص طور سے اگر عارف ہوتا تو وہ سویرا کی امی کا دو منٹ بھی سویرا کے پاس بیٹھنا دوبھر کردیتا۔ والدہ سے سویرا کو معلوم ہوا کہ خالہ زبیدہ کی حالت بہت اچھی نہیں' بیٹے کے غم نے انہیں نڈھال کردیا ہے۔

"احسن اب کیسا ہے؟" سویرا نے جھجک کر پوچھا۔

"وہ ٹھیک تو ہے لیکن ٹھیک رہے تو تب ہے نا۔ وہ جانتا بھی ہے کہ ماں کی یہ حالت اس کی وجہ سے ہوئی ہے پھر بھی اپنی ڈگر پر چل رہا ہے۔ توقیر بتا رہا تھا کہ اب وہ پھر ان مکینکوں کے پاس جا بیٹھا ہے جن سے مل کر اسپرٹ کا نشہ شروع کیا تھا۔"

وقت رخصت سویرا کی امی آبدیدہ ہوگئیں۔ بیٹی کا ماتھا چوم کر بولیں۔ "بیٹی! کسی دن تھوڑا سا وقت نکال کر خالہ سے مل آ۔ زندگی موت کا کوئی پتا نہیں ہوتا۔"

"میں یہیں بیٹھ کر ان کے لئے دعا کروں گی امی.......... مجھے اب.......... خود سے دور ہی رکھیں۔ مجھے بھول ہی جائیں آپ سب۔"

"بھول تو رہے ہیں بیٹی! روز سویرے اٹھ کر خود کو یقین دلاتے ہیں کہ سویرا اب اس گھر میں نہیں ہے مگر ماں صدقے اتنی دور بھی مت جا کہ ہماری جان چلی جائے۔ طریقے سے کہے گی تو ثاقب مان جائے گا۔ ایک بار ہو آ خالہ کے ہاں سے اور اگر ہو سکے تو اپنے بدنصیب بہن بھائیوں کو بھی شکل دکھا جانا۔"

"نہیں امی! مجھ میں ہمت نہیں ثاقب سے بات کرنے کی.......... اور احسن یا اس کے گھر والوں کے بارے میں بات کرنے کا تو میں سوچ بھی نہیں سکتی۔ اگر میں نہ آسکوں تو مجھے معاف کردیں امی!"

سویرا کی امی سویرا کے گلے لگ کر دیر تک روتی رہی تھیں' پھر سویرا کو آباد رہنے کی دعائیں دیتی ہوئی چلی گئیں۔

ثاقب ان دنوں بہت خاموش تھا' کسی سوچ میں گم رہتا تھا۔ رات کو ایک دو مرتبہ سویرا کی آنکھ کھلی تو اس نے ثاقب کو خواب گاہ کے قالین پر ٹہلتے پایا۔ اس نے ایک دوبار پوچھا بھی لیکن ثاقب نے کوئی واضح جواب نہیں دیا۔ سویرا کے دل میں آئی' شاید اسے اپنے بچوں کا خیال آرہا ہے۔ مگر اس خیال کو تھوڑی دیر میں سویرا نے خود ہی رد کر دیا۔ اب تک اس نے ثاقب کا جو تجزیہ کیا تھا' اس کے مطابق ثاقب کو اپنی دونوں بچیوں سے برائے نام انس تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ اس نے بچیوں کو اپنی تحویل میں رکھنے کے لئے کوئی کوشش نہیں کی تھی۔ نہ ہی بچیوں کی طرف سے کوئی ایسی خواہش ظاہر ہوئی تھی۔

گم صم رہنے کے باوجود سویرا کے ساتھ ثاقب کا رویہ نارمل ہی تھا بلکہ شاید معمول سے کچھ بہتر تھا۔ سویرا نے سوچا' ہو سکتا ہے کہ اس کے حوالے سے ثاقب کے دل میں کچھ نرمی پیدا ہو رہی ہو۔ ثاقب کی خاطر اس نے خود کو اپنے ہر رشتے ناتے سے دور کرلیا تھا۔ ثاقب کو وہ سب کچھ دیا تھا جس کی توقع کوئی شوہر اپنی شریک حیات سے کر سکتا ہے۔

اس کے ساتھ وہ شب و روز خدا کے حضور بھی گڑگڑاتی رہتی تھی۔ شاید یہ سب کچھ مل کر حالات میں تبدیلی کا باعث بن رہا تھا۔

ایک روز شام کے فوراً بعد ثاقب نے اسے تیار ہونے کے لئے کہا۔ "جانا کہاں ہے؟" سویرا نے پوچھا۔

"بھئی' کیا پہلے سے بتانا ضروری ہے؟"

"ٹھیک ہے' نہ بتائیں' حکم کی بندی کو بولنے کی ضرورت بھی کیا ہے؟" وہ مسکرائی۔

درحقیقت وہ استفسار کر کے ثاقب کا اچھا موڈ خراب کرنا نہیں چاہتی تھی۔ ثاقب کے خراب موڈ سے اسے بہت خوف آنے لگا تھا۔ خاص طور سے احسن والے واقعے کے بعد وہ ہروقت ڈری رہتی تھی کہ کہیں ثاقب' احسن کے حوالے سے کوئی تلخ بات نہ کہہ دے۔ تسلی کی بات یہ تھی کہ ابھی تک اس نے کوئی ایسی بات کہی نہیں تھی۔

وہ تیار ہو کر ثاقب کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ گئی۔ ثاقب ڈرائیونگ کے ساتھ ساتھ موبائل فون پر کسی سے کاروباری باتیں کر رہا تھا اور اپنے ہی حال میں مگن تھا۔ سویرا اس کے پہلو میں بیٹھی سوچ رہی تھی کہ وہ کہاں جا رہے ہیں۔ دفعتاً اسے اندازہ ہوا کہ ان کا رخ اس اسپتال کی طرف ہے جہاں خالہ زبیدہ زیر علاج تھیں۔

سویرا کے جسم میں سنسناہٹ دوڑ گئی۔ اس کا مطلب تھا کہ اس کا اندازہ درست ہے۔ ثاقب کے رویے میں تبدیلی کے آثار تھے۔ وہ دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کر رہی تھی اور دعا کر رہی تھی کہ ان کی منزل وہ اسپتال ہی ہو جہاں احسن کی امی زیر علاج ہیں۔

جب گاڑی اسپتال کے قریب گزر کر آگے بڑھ گئی تو سویرا کو دھچکا سا لگا۔ بہرحال اس قسم کے دھچکوں کی وہ عادی ہو چکی تھی۔ غم سہہ سہہ کر اس کے اندر غم کے لئے وسیع گنجائش پیدا ہو گئی تھی۔ وہ لوگ شاہراہ قائداعظم پر پہنچے اور پھر پرل کانٹی نینٹل کے پارکنگ ایریا میں داخل ہو گئے۔

ثاقب بولا۔ "ایک بڑے اچھے دوست ہیں۔ یہاں ان سے ملاقات ہو جائے گی اور کھانا بھی کھالیں گے۔"

"لگتا ہے کوئی کاروباری دوست ہی ہیں۔" سویرا نے اندرونی جذبات چھپا کر خوش

دلی سے پوچھا۔

"کاروباری نہیں دفتری......... ان کا نام عالمگیر چوہدری ہے۔ ہمارے ہی محکمے کے عالمگیر چوہدری ڈپٹی ڈائریکٹر ایڈمن!" ایک لمحہ توقف کر کے ثاقب نے اپنی رسٹ واچ دیکھی اور بولا۔ "ابھی تھوڑا سا وقت ہے۔ میرا خیال ہے کہ میں عالم چوہدری صاحب کے بارے میں تمہیں تھوڑا سا بتا ہی دوں۔"

"جی' میں سن رہی ہوں۔"

ثاقب نے سگریٹ سلگا کر اوپر تلے چند گہرے کش لیے اور گمبھیر آواز میں بولا۔ "سویرا' میں ایک بڑی مصیبت میں پھنسا ہوا ہوں۔ اگر نکل نہ سکا تو سمجھو' ایک سنگین فوجداری کیس میں الجھ جاؤں گا۔"

"فوجداری کیس!"

ثاقب نے لرزاں ہاتھوں سے سگریٹ کا ایک طویل کش لے کر کہا۔ "یہ ڈھائی تین سال پہلے کی بات ہے محکمہ آثار قدیمہ کا ایک انچارج افسر فاروق رضی میرے پاس آیا۔ اس نے بتایا کہ یہاں لاہور میں ہی محکمے کی چار پانچ کینال بڑی قیمتی اراضی موجود ہے۔ ایک قبضہ گروپ اس جگہ پر قبضے کا پروگرام بنا رہا ہے اور ان لوگوں نے یہ کام کر گزرنا ہے۔ جب یہ کام ہونا ہی ہے تو پھر ہم کیوں نہ کریں۔ ہم یہ سب کچھ زیادہ آسانی اور محفوظ طریقے سے کر سکیں گے......... اگر تم تھوڑی سی مدد کرو تو یہ زمین ہمارے ہاتھ آ سکتی ہے۔ میں فاروق کی باتوں میں آ گیا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ اس کام میں دونوں محکموں کے چار پانچ اور بندے بھی حصے دار تھے۔ یوں سمجھو کہ سارا بوجھ اپنے کندھوں پر ڈالنے کے باوجود میرے حصے میں کچھ زیادہ رقم نہیں آئی۔ یہ میری ایک ایسی غلطی تھی جس پر آج تک پچھتا رہا ہوں بلکہ......... اب تو یہ پچھتاوا کئی گنا بڑھ گیا ہے۔"

ثاقب نے چند لمحے توقف کر کے گولڈ لیف کے دو گہرے کش لئے اور سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "ہمارے محکمے کے عالم چوہدری نے یہ ڈھائی تین سال پرانی فائل کھول لی ہے اور انکوائری شروع کر دی ہے۔ وہ بڑے افسر تو ایک طرف ہو گئے ہیں اور سب سے زیادہ میں لپیٹ میں آ گیا ہوں۔ اگر عالم صاحب نے Favour نہیں کی تو سمجھو

دو تین ہفتوں میں ہتھکڑی لگ جائے گی .... اور یہ ہتھکڑی آسانی سے کھلنے والی بھی نہیں۔" خنک موسم میں بھی ثاقب کی سانولی پیشانی پر پسینے کی بوندیں چمکنے لگی تھیں۔

سویرا خاموش بیٹھی سن رہی تھی۔ نہ جانے کیوں اس کی چھٹی حس کہا کرتی تھی کہ عنقریب وہ اس قسم کی کوئی منحوس خبر سنے گی۔ ثاقب کا کوئی ایسا کارنامہ جو اس کے غم کی جھیل میں رنج و الم کے ایک اور بہت بڑے آبشار کی طرح آگرے گا......... اور آج ایسا ہی ہوا تھا۔ وہ کچھ بھی نہ کہہ سکی' بس اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتی رہی۔ ثاقب کی آواز جیسے کہیں بہت دور سے اس کے کانوں تک پہنچ رہی تھی' وہ کہہ رہا تھا۔ "میں بڑی مشکل سے عالم صاحب کو ہینڈل کرنے کی کوشش کررہا ہوں۔ خوش قسمتی ہے کہ انہوں نے ہمارے ساتھ کھانے کی دعوت قبول کرلی ہے۔ ورنہ وہ بڑے بڑے افسروں کو خاطر میں نہیں لاتے ہیں۔ کوئی معمولی ملازم نہیں ہیں۔ پیچھے سے ان کا کھونٹا بڑا مضبوط ہے۔ کھاتے پیتے گھرانے سے تعلق ہے' گاؤں میں کئی مربع زمین ہے۔ سمجھو کہ ایک دھڑلے دار چوہدری ہے جس کے پاس ڈپٹی ڈائریکٹر کی کرسی بھی موجود ہے۔ اگر عالم صاحب نے تھوڑی سی نرمی کرلی تو سمجھو ایک بہت بڑی مصیبت سے بچ جائیں گے ہم سب۔"

سویرا کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا کہ وہ اس موقع پر کیا کہے۔ بس وہ خاموشی سے ثاقب کی باتیں سنتی جارہی تھی۔ اس کے ذہن کے اندر کہیں بہت گہرائی میں بے نام اندیشے جھلک رہے تھے۔ قریباً پندرہ منٹ بعد وہ لوگ ہوٹل کے اندر عالم چوہدری صاحب کے ساتھ کھانے کی میز پر بیٹھے تھے۔ سویرا نے کن انکھیوں سے دیکھا' عالم چوہدری شکل و صورت سے واقعی چوہدری ہی نظر آتا تھا۔ اس کی عمر چالیس کے لگ بھگ تھی۔ رنگ سرخ و سفید' جبڑے چوڑے جو اس کی جسمانی مضبوطی اور مزاج کی سختی کو ظاہر کرتے تھے۔ اس کی آنکھوں میں امارت' اختیار اور ذہانت کا نشہ تیر رہا تھا۔ اس کی صورت دیکھتے ہی سویرا کو اندازہ ہوگیا تھا کہ یہ کسی پہلو سے بھی اچھا شخص نہیں ہے۔

کھانے کے دوران میں عالم چوہدری نے بہت کم گفتگو کی' زیادہ وقت ثاقب ہی خوشامدی لہجے میں بولتا رہا۔ گاہے گاہے ثاقب نے سویرا کو بھی ٹہوکا دیا کہ وہ عالم چوہدری سے بات کرے۔ کوشش کے باوجود سویرا دو تین جملوں سے زیادہ نہ بول سکی۔ وہ محسوس

کررہی تھی کہ عالم چوہدری کی پُرتپش نگاہیں بار بار اس کے سراپے سے ٹکرا رہی ہیں۔ ثاقب سے بات کرتے ہوئے عالم چوہدری کے لہجے میں عجیب سی کرختگی اور رعونت آجاتی تھی تاہم اس نے سویرا سے جو دو چار باتیں کیں' وہ قدرے مہربان لہجے میں کیں۔ اس نے سویرا کی مصروفیت اور مشاغل وغیرہ کے بارے میں پوچھا۔

بوفے ڈنر کرنے کے بعد وہ لوگ ہوٹل سے رخصت ہوگئے تاہم عالم چوہدری وہیں رہا۔ اسے کسی اور بندے سے بھی ملنا تھا۔ وقت رخصت ثاقب نے بڑے خوشامدی لہجے میں عالم چوہدری سے کہا۔ "اگلے ہفتے آپ کے لئے راوی کی اصلی کھگا مچھلی منگوا رہا ہوں۔ سویرا یہ مچھلی ایسی پکاتی ہے کہ بس کمال کردیتی ہے۔ آپ اگر اگلے ہفتے غریب خانے پر تشریف لائیں گے تو بڑی ذرہ نوازی ہوگی۔"

اس کے ساتھ ہی ثاقب نے سویرا کو ٹہوکا دیا۔ مجبوراً سویرا کو بھی کہنا پڑا۔ "آپ ضرور تشریف لائیں جناب!"

عالم چوہدری نے اپنی کھڑکھڑ کرتی کلف دار شلوار قمیض کی سلوٹوں کو درست کرتے ہوئے کہا۔ "اگر آپ اتنی محبت سے بلا رہے ہیں تو پھر ضرور سوچیں گے......... لیکن........."

"لیکن کیا سر!" ثاقب نے جلدی سے کہا۔

"وہ دو کاغذ کل تک ضرور تیار کرالینا ورنہ میرے لئے بڑی مشکل ہو جائے گی۔" اس نے ایک بار پھر دفتری لب و لہجہ اختیار کرتے ہوئے کہا۔

"ہو جائے گا سر.........! انشاء اللہ ہو جائے گا......... آپ کا حکم ہے تو ضرور ہو گا۔"

راستے میں ثاقب ایک بار پھر اپنے پریشان خیالوں میں کھو گیا۔ سویرا اس کے ساتھ گاڑی میں بیٹھے ہوئے بھی تنہا ہوگئی۔ کتنی عجیب بات ہے' بعض اوقات ہزاروں میل دور بیٹھے ہوئے لوگ بھی ذہنی طور پر ایک دوسرے کے ساتھ ہوتے ہیں اور کبھی کبھی شانہ بشانہ چلنے والے لوگوں کے بیچ میں طویل فاصلے ہوتے ہیں۔ سویرا نے بڑے درد کے ساتھ سوچا۔ وہ گھر سے کیا آس لے کر نکلی تھی اور باہر آکر ہوا کیا تھا۔ خالہ زبیدہ کی تیمارداری

کرنے کے بجائے وہ اس عالی شان ہوٹل میں ایک ذیشان شخص سے ملنے آگئے تھے۔
انسان کی تمنائیں بھی اسے کیسے کیسے فریب دیتی ہیں' پچھلے کئی دنوں سے ثاقب خاموش تھا' سویرا سمجھ رہی تھی کہ شاید اس کی یہ خاموشی سویرا کی خاطر ہے اور ان حالات کی خاطر ہے جن کا دکھ سویرا اپنے سینے میں محسوس کر رہی ہے۔ وہ اپنے ساتھ ثاقب کے قدرے مہربان رویے کو بھی اسی حوالے سے دیکھ رہی تھی لیکن یہ اور ہی چکر نکلا تھا۔
آئندہ ہفتے حسب پروگرام ثاقب اپنے افسر ڈپٹی ڈائریکٹر عالم چوہدری کو اپنی رہائش گاہ پر لانے میں کامیاب رہا۔ اس دوسری ملاقات کے بعد سویرا کے ذہن کی گہرائی میں ابھرنے والے موہوم اندیشے نمایاں ہوگئے۔ ثاقب اپنے افسر کے سامنے بچھا جا رہا تھا اور شاید......... اس کی خواہش تھی کہ مستقبل میں......... سویرا بھی اس کے سامنے بچھ جائے۔ سرکاری ملازم ہونے کے باوجود ڈپٹی ڈائریکٹر عالم کی تمام حرکات و سکنات عیاش چوہدریوں جیسی تھیں۔ سویرا کی موجودگی میں ہی وہ ثاقب کے ساتھ شکار' شراب اور شباب وغیرہ کی باتیں کرتا رہا۔ غالباً اس نے سویرا کو مرعوب کرنے کے لئے ہی اپنے ایک دو تحکمانہ دنگلوں کی روداد میاں بیوی کے سامنے بیان کی۔ اس نے بتایا کہ کس طرح اس نے تجاوزات گرانے کے تنازع پر ایک وزیر کے بیٹے کو سرعام تھپڑ مارے تھے اور بعد میں وزیر کو خود آکر معافی مانگنا پڑی تھی۔ اس نے نشیلے انداز میں مسکراتے ہوئے کہا۔ "ہم صرف دفتری بابو نہیں ہیں' وقت پڑنے پر ڈانگ سوٹا بھی پورا پورا کر لیتے ہیں۔ اس محکمے میں رہنے کے لئے بندے کی کاٹھی بڑی تگڑی ہونی چاہیے۔"
شاید وہ ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ عالم چوہدری کے بھاری بھرکم جبڑے کے نیچے اور کنپٹی کے قریب دو پرانے زخموں کے نشان موجود تھے جو غالباً کسی مارکٹائی ہی کا نتیجہ رہے ہوں گے......... وہ ترنگ میں بولا۔ "یہ سرکاری ملازمت تو بس شوق شوق میں گلے پڑ گئی ہے' ورنہ اوپر والے کا دیا سب کچھ ہے۔"
اس کے بعد وہ ان نوازشات کی تفصیل بتانے لگا جو "اوپر والے" نے اس پر کر رکھی تھیں اور جن نوازشات کے باوجود وہ دن رات حرام کھانے پر کمربستہ تھا۔
عالم چوہدری کے جانے کے بعد ثاقب سویرا سے خفا خفا نظر آ رہا تھا۔ اس کی خفگی کی

وجہ سویرا بخوبی جانتی تھی۔ ثاقب کے بار بار کے ٹھوکوں اور اشاروں کے باوجود سویرا نے عالم چوہدری صاحب کے ساتھ زیادہ بے تکلفی سے بات چیت نہیں کی تھی۔ جب ثاقب کو ایک ضروری فون سننے کے لئے دوسرے کمرے میں جانا پڑا تھا تو سویرا نے عالم صاحب کے ساتھ کمرے میں تنہا بیٹھنے سے بھی گریز کیا تھا۔
رات کو ثاقب' سویرا پر پھٹ پڑا۔ "یوں ڈر سہم کر بیٹھی ہوئی تھیں جیسے وہ کوئی آدم خور درندہ ہے جو ابھی تم کو چیر پھاڑ ڈالے گا۔ بھئی وہ افسر ہے ہمارا......... مہمان بھی تھا اور کچھ نہیں تو بندہ چہرے پر مسکراہٹ لا کر ہی بات کر لیتا ہے۔"
"وہ افسر آپ کا ہے' میرا نہیں ہے۔ میرے لئے سب کچھ آپ ہیں......... اور......... سچ پوچھیں تو مجھے یہ بندہ اچھا نہیں لگا۔"
ایک دم ثاقب کا پارا چڑھ گیا۔ گہرا سانولا رنگ اور گہرا ہوگیا۔ سویرا کی طرف انگلی اٹھا کر بولا۔ "دیکھو سویرا' اس گھر میں تمہیں ویسے ہی چلنا ہوگا جیسے میں کہوں گا۔ یہ سوسائٹی کے ساتھ چلنے کا زمانہ ہے۔ یہ چھوئی موئی دیسی عورت کا بہروپ ختم کرو اب۔ میں جانتا ہوں یہ ساری ڈرامے بازیاں۔"
"کیا جانتے ہیں آپ؟"
"میری زبان مت کھلواؤ سویرا! تمہارے اس نشئی عاشق کا نام لوں گا تو آگ لگ جائے گی تمہیں۔ بس ان باتوں کو لپیٹا ہی رہنے دو۔"
سویرا کے تن بدن میں واقعی آگ لگ گئی تھی۔ تاہم وہ اپنے لہجے کو نارمل رکھتے ہوئے بولی۔ "آپ مت پردہ پوشی کریں میری......... جو کہنا چاہتے ہیں کہیں' آپ کا ذہن میرے بارے میں صاف ہونا چاہیے۔"
"میرا ذہن صاف ہوا تو تمہاری بھی طبیعت صاف ہو جائے گی۔" اس نے تڑخ کر کہا اور پھر اس کی زبان کھلتی چلی گئی۔
اگلے آدھ پون گھنٹے کے درمیان ان دونوں کے درمیان جو گفتگو ہوئی وہ خاصی سنگین نوعیت کی تھی۔ احسن کے حوالے سے ثاقب نے سویرا پر وہ تمام الزامات لگائے جن کا اندیشہ سویرا کے ذہن میں موجود تھا اس کے بعد ڈھکے چھپے الفاظ میں اس نے سویرا

پر یہ بھی واضح کردیا کہ اسے اس گھر میں ثاقب کے اشاروں پر چلنا ہوگا۔ اس گھر میں جائز اور ناجائز کا فیصلہ بھی ثاقب ہی کرے گا۔

ثاقب کی اندرونی خباثت اور بزدلی اب کھل کر سامنے آرہی تھی بلکہ اس بزدلی کو بے غیرتی کہنا زیادہ مناسب تھا۔ اس نے چند ماہ پہلے نوخیز سویرا کو دھونس سے حاصل کیا تھا' اب اسے بھی ایک دھونس کا سامنا تھا اور یہ دھونس اسے سویرا کے بارے میں نہایت غلط انداز میں سوچنے پر مجبور کررہی تھی۔ اپنے جیسے روایتی بے غیرتوں کی طرح ایک زبردست شخص کی زبردستی سے بچنے کے لئے وہ غالباً اپنی نوجوان بیوی کو اس کے سامنے رشوت کے طور پر پھینکنا چاہ رہا تھا۔

اس سے اگلے روز سویرا اپنے سینے میں آنسوؤں کا سمندر چھپائے اپنی امی کے گھر آگئی تھی۔ گناہ پر آمادہ کرنے والی اس چاردیواری کے اندر اس کا دم گھٹنے لگا تھا اور ثاقب کی صورت دیکھتے ہی اسے متلی ہونے لگتی تھی۔ ثاقب کی وہ بدبو جو کچھ دیر کے لئے سویرا کے احساس میں دب سی گئی تھی یا شاید سویرا کی بے پناہ مجبوریوں نے اسے دبا دیا تھا' اب پھر شدت سے ابھر کر سامنے آگئی تھی۔

سویرا اپنے اہل خانہ کی پریشانیوں میں مزید اضافہ کرنا نہیں چاہتی تھی۔ اس نے انہیں اس سنگین جھگڑے کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا جو ثاقب کے ساتھ گزشتہ رات ہوا تھا نہ ہی اس جھگڑے کی نوعیت کے بارے میں اس نے ہوا لگنے دی تھی۔ بس یہی کہا تھا کہ ویسا ہی عام سا جھگڑا تھا جیسے میاں بیوی کے درمیان ہو جایا کرتے ہیں۔

سویرا کے اہلِ خانہ کے حالات اب قدرے بہتر تھے۔ توقیر سروس کررہا تھا۔ امی کی حالت آپریشن کے بغیر ہی بہتر ہونا شروع ہوگئی تھی اور ڈاکٹروں نے کہا تھا کہ شاید آپریشن کے بغیر میڈی کیشن کے ذریعے ہی معاملہ سدھر جائے۔ وہ اب تھوڑی بہت کڑھائی سلائی کرنے لگی تھیں۔ یہ سلائی کڑھائی بھی گھر کی آمدن میں تھوڑا بہت اضافہ کررہی تھی۔

بچے تو اپنی آپی کی آمد پر بہت خوش ہوئے تھے' تاہم سویرا نے محسوس کیا تھا کہ امی اور توقیر اس کے یوں جھگڑ کر آنے سے خوش نہیں تھے۔ خاص طور سے توقیر تو اس سے سیدھے منہ بات ہی نہیں کررہا تھا۔ وہ ثاقب کو اپنا ان داتا سمجھ کر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کا

خیال تھا کہ ثاقب کی کسی بھی طرح کی ناراضی اس گھرانے کی مشکلات میں اضافے کا سبب بن جائے گی۔

چار پانچ دن بعد ہی امی نے ڈھکے چھپے الفاظ میں سویرا سے کہنا شروع کردیا کہ وہ فون کرکے ثاقب کو بلالے۔ وہ چن چن کر ایسی باتیں اور حکایتیں سویرا کے سامنے بیان کرنے لگی تھیں جن سے ثابت ہوتا تھا کہ شادی کے بعد خاوند ہی عورت کا سب کچھ ہوتا ہے اور اسے مجازی خدا قرار دیا جاتا ہے جس عورت سے اس کا خاوند خفا ہو وہ قدرت کی طرف سے لعنت ملامت اور نحوست کی لپیٹ میں آجاتی ہے وغیرہ وغیرہ۔ سویرا شاید اس بارے میں اپنی امی سے زیادہ جانتی تھی مگر وہ خاموشی سے سنتی رہتی تھی۔ ویسے بھی وہ یہ بات اچھی طرح جانتی تھی کہ امی بے چاری توقیر بھائی کا نکتہ نظر بیان کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔

چند دن بعد کی بات ہے' توقیر شام کو دفتر سے گھر لوٹا تو بالکل گم صم تھا۔ سویرا اپنی امی اور پنکی کے ساتھ کمرے میں بیٹھی تھی۔ توقیر نے تحکمانہ لہجے میں پنکی کو باہر جانے کے لئے کہا پھر اس نے بڑے تلخ انداز میں سویرا کے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے اور بولا۔ "خدا کے لئے سویرا! تم اپنے گھر جاؤ۔ ہماری مشکلات میں اضافہ مت کرو۔ ثاقب بھائی برے آدمی نہیں ہیں۔ تم بھی اپنا دل صاف کرو۔ اگر کوئی ایسی ویسی بات تمہارے منہ سے نکل گئی ہے تو ان سے معذرت کرلو۔"

"بات میرے نہیں' ان کے منہ سے نکلی ہے۔"

"ہٹ دھری والی باتیں مت کرو سویرا۔ تم جانتی نہیں ہو کہ ثاقب بھائی کی ناراضی ہمیں کتنی مہنگی پڑ سکتی ہے۔ سچ پوچھو تو یہ گھر ان کے احسانوں کی وجہ سے ہی چل رہا ہے۔"

"بھائی! ابھی تو آپ کہہ رہے تھے کہ وہ برے آدمی نہیں ہیں۔ اب آپ کہہ رہے ہیں کہ وہ ناراض ہوئے تو ہمیں نقصان پہنچائیں گے۔"

"بحث مت کرو سویرا۔ شاید تم نے ثاقب بھائی کے ساتھ بھی اسی طرح کی تکرار کی ہے؟"

سویرا نے ابھی تک اس جھگڑے کی نوعیت کے بارے میں کسی کو کچھ نہیں بتایا تھا جو اس کے اور ثاقب کے بیچ میں ہوا تھا لیکن جب اس نے دیکھا کہ توقیر اپنے مفاد کے لئے اندھا دھند ثاقب کی حمایت کر رہا ہے اور سویرا کو ناسمجھ قرار دے رہا ہے تو اس نے جھگڑے کی نوعیت کا تھوڑا بہت اظہار توقیر اور والدہ پر کردیا۔ اس کا دل غم سے لبریز تھا اور آنکھوں میں آنسو ساون بھادوں کی بارش کی طرح امڈ رہے تھے۔

یہ جان کر سویرا کو تعجب ہوا کہ معاملے کی نوعیت محسوس ہو جانے کے باوجود توقیر نے بلاتوقف ثاقب بشیر کی حمایت جاری رکھی۔ وہ بولا۔ ''سویرا' میری زبان مت کھلواؤ۔ تم میری بہن ہو' میں تمہارے سامنے کوئی ایسی بات کہنا نہیں چاہتا جس سے تمہیں شرمندگی ہو اور مجھے بھی.......... مختصر بات یہی ہے کہ ثاقب صاحب کے ساتھ تمہاری جو بھی ناچاقی ہے' اسے دور کرو اور اپنے گھر جاؤ۔ تم اپنے شوہر کے ساتھ ٹھیک سے رہو گی تو اس گھر کے دروازے تمہارے لئے ہمیشہ کھلے ہیں لیکن اگر لڑ جھگڑ کر آؤ گی تو ہم خوش نہیں ہوں گے۔''

سویرا سے اور برداشت نہیں ہوا تھا۔ وہ بمشکل اپنی ہچکیاں روکتی ہوئی اٹھی اور دوسرے کمرے میں جا کر بستر پر گر کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی۔ دس پندرہ منٹ بعد اس کی والدہ اندر آئی تھیں۔ وہ دروازہ بند کر کے بولیں۔ ''سویرا' میں یہ توقیر سے کیا سن رہی ہوں؟''

''کیا سن رہی ہیں؟'' سویرا نے آنسوؤں سے بھیگا ہوا چہرہ اوپر اٹھایا۔

''کیا تم شادی کے بعد بھی.......... میرا مطلب ہے کہ شادی کے بعد بھی احسن سے تمہاری بات ہوئی ہے یا اس سے ملی ہو؟''

''یہ کس نے کہا ہے آپ سے؟''

''یہ بات ثاقب نے تمہارے بھائی توقیر کے سامنے کہی ہے۔ اب توقیر مجھے بتا رہا ہے۔''

اب سویرا کی سمجھ میں یہ بات آئی کہ تھوڑی دیر پہلے توقیر نے کیوں کہا تھا کہ میری زبان مت کھلواؤ' میں تمہیں شرمندہ کرنا نہیں چاہتا۔

وہ آنسوؤں کے درمیان کراہ کر بولی۔ ''امی' یہ سب بہتان ہے' جھوٹا الزام ہے مجھ پر۔ آپ تو مجھے جانتی ہیں۔ آپ سوچ سکتی ہیں کہ میں ایسا کر سکتی ہوں؟'' وہ بلک بلک کر رونے لگی۔

ماں نے اسے گلے سے لگالیا اور دلاسا دینے کی کوشش کرنے لگیں۔ پھر اس نے کہا ''بیٹی! میں جانتی ہوں کہ تو ٹھیک کہہ رہی ہے لیکن یہ دنیا بڑی ظالم ہے۔ تلوار کے ایک طرف دھار ہوتی ہے' دنیا کے دونوں طرف ہے.......... یہ جو میاں بیوی کا رشتہ ہوتا ہے نا' یہ بڑا نازک ہے۔ ذرا سی ضد اور بے احتیاطی کی وجہ سے یہ کچے دھاگے کی طرح ٹوٹ سکتا ہے۔ اس رشتے کو بچانے کے لئے اکثر عورت کو ہی زیادہ کوشش کرنا پڑتی ہے کیونکہ زیادہ نقصان بھی اسی کا ہونا ہوتا ہے۔ میری بچی' اگر تیرے خاوند کو تجھ سے کوئی شکایت ہے تو وہ دور کردے۔ اسی میں تیرا اور ہم سب کا بھلا ہے۔''

ماں نے آخری الفاظ اتنے دردناک انداز میں کہے تھے کہ سویرا لرز اٹھی۔ ماں نے کہا نہیں تھا لیکن یہ بات سویرا کی سمجھ میں آگئی تھی کہ اگر ثاقب اس سے ناخوش رہا تو بہت کچھ ہو سکتا ہے۔ توقیر کی نوکری بھی جا سکتی ہے' ان کے سروں پر موجود چھت بھی سرک سکتی ہے اور پنکی کے رشتے کی جو بات چل رہی ہے' وہ بھی ٹھپ ہو سکتی ہے۔

اگلے دو تین روز میں توقیر کے رویے نے یہ ثابت کردیا تھا کہ وہ سویرا کو مزید اپنے گھر میں رکھنا نہیں چاہتا ہے۔ سویرا ایک دوراہے پر تھی اور اس کا دل غم سے لبریز تھا۔ اسے رہ رہ کر ابو یاد آرہے تھے۔ آج وہ زندہ ہوتے تو کیا میکہ اس کے لئے اتنا اجنبی ہو جاتا؟ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے عافیت کی ایک گود تھی جو اس سے چھن گئی ہے۔ اب وہ اپنی ازدواجی زندگی کے تمام مسائل کا مقابلہ کرنے کے لئے یکسر تنہا ہے۔ کمزور' لاچار اور بے بس۔ وہ بڑے مان سے اپنی پناہ گاہ میں آئی تھی اور اب بڑی بے بسی سے واپس جانے کا سوچ رہی تھی۔ ان دو گھروں کے علاوہ وہ اور جا بھی کہاں سکتی تھی۔ قرب و جوار میں کوئی عزیز رشتے دار نہیں تھا۔ نہ کوئی ایسی سکھی سہیلی تھی جس کا گھر اس کے لئے پناہ گاہ ثابت ہو سکتا۔

اس نے ایک پی سی او سے ثاقب کو فون کر کے اس سے کہا کہ وہ گھر آنا چاہتی ہے'

وہ آکر اسے لے جائے۔

ثاقب نے ''اچھا'' کہہ کر فون بند کردیا۔

اس شام ثاقب خود تو نہیں آیا تاہم اس کی بھیجی ہوئی گاڑی آگئی۔ اس گاڑی میں ثاقب کا بھائی عارف اسے لینے آیا تھا۔ بہن بھائیوں کو گلے سے لگا کر اور ماں کے سینے سے چمٹ کر سویرا نے دیر تک آنسو بہائے اور پھر اپنے گھر واپس آگئی۔

چند روز تو ٹھیک گزرے یوں لگتا تھا کہ ثاقب اپنے دفتری مسئلے اور ڈپٹی ڈائریکٹر عالم چوہدری وغیرہ کو بھول چکا ہے لیکن حقیقت میں ایسا نہیں تھا' یہ سارے معاملات اسی طرح چل رہے تھے۔ جلد ہی سویرا کو اندازہ ہوگیا کہ ثاقب بدستور اپنے جرم کے شکنجے میں جکڑا ہوا ہے اور اس کی گوناگوں پریشانیاں بھی برقرار ہیں۔ ایک روز ڈرائنگ روم میں ثاقب اپنے دوست فاروق اور ایک دوسرے شخص کے ساتھ بیٹھا تھا' ان کی گفتگو کا تھوڑا سا حصہ اتفاقاً سویرا کے کانوں میں پڑ گیا۔ اس گفتگو سے سویرا کو اندازہ ہوا کہ بات صرف ایک جگہ کی نہیں.......... محکمہ آثار قدیمہ کی دو تین جگہیں ایسی ہیں جن میں زبردست گھپلا ہوا ہے اور اس گھپلے میں ثاقب پوری طرح ملوث ہے۔ ڈپٹی ڈائریکٹر عالم چوہدری ہاتھ دھو کر ثاقب اور فاروق کے پیچھے پڑ چکا ہے اور انکوائری میں انہیں کوئی رعایت دینے کو تیار نہیں۔

ایک دن شام کو ثاقب گھر آیا تو اس کا رنگ اڑا ہوا تھا۔ اس نے کسی سے کوئی بات کی اور نہ کھانا کھایا۔ وہ بار بار باتھ روم کا رخ کررہا تھا۔ رات آٹھ نو بجے سویرا نے اسے فون پر کسی سے بات کرتے سنا۔ بات کرتے ہوئے ثاقب کے ہاتھ پاؤں کانپ رہے تھے اور وہ بھیک منگوں کے انداز میں کسی اکبر نامی شخص کی منت سماجت کررہا تھا۔ سویرا اسے دیکھ رہی تھی اور سوچ رہی تھی کہ کیا یہ وہی شخص ہے جو ایک دن اس کے اور اس کے گھر والوں کے لئے فرعون بنا ہوا تھا؟ اپنے اختیار کے استعمال سے انہیں دہشت زدہ کررہا تھا اور اپنی من مانی کرنے کے لئے ان کے گرد جالا بن رہا تھا۔ آج وہ خود ایک جالے میں الجھا ہوا تھا اور بے بسی سے ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔ سچ کہتے ہیں کہ ہر بڑی مچھلی چھوٹی مچھلی کو کھاتی ہے۔ دوسرے دن اتوار کی چھٹی تھی۔ دس گیارہ بجے ثاقب نے سویرا کو بازار چلنے

کے لئے کہا۔ وہ دونوں گاڑی میں بیٹھے اور لبرٹی مارکیٹ کی طرف روانہ ہوگئے۔ راستے میں کئی بار سویرا کے جی میں آئی کہ وہ ثاقب سے ''کیس انکوائری'' کے بارے میں کچھ پوچھے لیکن نہ جانے کیا بات تھی' اس بارے میں بات کرتے ہوئے وہ اب ایک جھجک سی محسوس کرنے لگی تھی۔

راستے میں ثاقب نے کہا۔ ''یہاں ایک ملنے والے کے ہاں تھوڑی دیر کے لئے رکنا ہے۔''

وہ سویرا کو ایک کوٹھی میں لے آیا۔ دونوں گاڑی سے اترے اور ایک وسیع و عریض ڈرائنگ روم میں پہنچ گئے۔ باوردی ملازم نے کہا۔ ''صاحب کے آنے میں دیر ہے۔ آپ اس وقت تک بیٹھ کر چائے وغیرہ پئیں۔''

وہ گرین ٹی لے آیا۔ چائے پینے کے تھوڑی ہی دیر بعد سویرا پر غنودگی طاری ہونا شروع ہوگئی۔ اس غنودگی نے اتنی سرعت سے سویرا کے حواس کو ڈھانپا کہ وہ دیکھتے ہی دیکھتے ہر احساس سے عاری ہوگئی۔

☆==========☆==========☆

اس کے بعد کے احساسات ٹوٹے پھوٹے سے کئی مناظر پر مشتمل تھے۔ کچھ مناظر سویرا کو واضح نظر آئے تھے، کچھ دھند میں لپٹے ہوئے تھے اور کچھ گھسی پٹی بہت پرانی فلم کی طرح مدھم مدھم تھے۔ سویرا کو یوں لگا جیسے احسن اس کے شانے سے شانہ ملائے چل رہا ہے۔ وہ کسی باغ میں گھوم رہے ہیں۔ احسن نے بالکل اجلا سفید لباس پہن رکھا ہے، سفید پتلون، سفید جوتے، سفید ٹائی، سفید موزے، اس کے بال کشادہ پیشانی پر لہرا رہے ہیں۔ اس کے ہونٹوں پر الوہی مسکراہٹ ہے۔ سویرا اسی براؤن اور سیاہ لباس میں ہے جو احسن کو بہت پسند تھا۔ دونوں کے ہاتھ باہم پیوست ہیں۔ ان کے قدم زمین پر پڑنے کے بجائے جیسے ہوا میں پڑ رہے ہیں۔ پھر ایک دم گڑگڑاہٹ سنائی دیتی ہے۔ کئی بڑے بڑے دیوہیکل بلڈوزر ان کی طرف چلے آرہے ہیں۔ ان کے زرد رنگ زرد دھوپ میں چمک رہے ہیں۔ احسن اور سویرا ان بلڈوزروں کی زد سے بچنے کے لئے بھاگتے ہیں۔ احسن کا مضبوط ہاتھ سویرا کے ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہے۔ وہ دیکھتی ہے، ایک بلڈوزر احسن کے اوپر سے گزر رہا ہے، وہ خود کو سمجھانے کی کوشش کرتی ہے کہ یہ حقیقت نہیں، یہ تو اس پُراسرار نشے کا ردعمل ہے جو اس کے دماغ میں سیاہ دھند کی طرح بھرا ہوا ہے۔ وہ سوچنے لگی۔ ہاں، وہ شدید نشے کے زیر اثر ہے۔ اس کے ساتھ ایک بہت بڑا دھوکا ہو چکا ہے، اسے کچھ پلا دیا گیا ہے۔ وہ سو نہیں رہی تھی۔ پھر بھی اپنے ارادوں پر عمل نہیں کر سکتی تھی۔ وہ اس تہہ در تہہ غنودگی کے اندر سے نکلنے کی کوشش کرنے لگی جو اسے ہر طرف سے ڈھانپے ہوئے تھی.......... مگر یہ ناممکن تھا۔ وہ کسی کو اپنے بہت قریب محسوس کر رہی تھی۔ کوئی جسم تھا.......... کوئی کپڑا تھا، یا گرم ہوا تھی جو سانپ کی طرح پھنکار رہی تھی یا کوئی نادیدہ بوجھ تھا جو اسے کچل رہا تھا یا کوئی نامعلوم کھردرا لمس تھا.......... ہاں وہ کسی

بہت بڑے دھوکے کے حصار میں تھی.......... ایک بار پھر اس کا ذہن گہری تاریکیوں میں ڈوب گیا۔

اس کی آنکھ کھلی تو وہ ایک کمبل کے نیچے نیم عریاں پڑی تھی۔ وہ کتنی ہی دیر خالی خالی نظروں سے قرب و جوار کو دیکھتی رہی اور خود کو سمجھانے کی کوشش کرتی رہی کہ وہ واقعی وہ سب کچھ دیکھ رہی ہے۔

یہ ایک وسیع خواب گاہ تھی۔ سویرا کو اندازہ ہوا کہ وہ اس مقام پر نہیں ہے جہاں اس نے ثاقب کے ساتھ بیٹھ کر چائے پی تھی اور پھر.......... بے ہوشی کا شکار ہوئی تھی۔ یہ کوئی اور عمارت لگتی تھی.......... وہ بے آواز رونے لگی جو کچھ اس کے ساتھ ہو چکا تھا، وہ اس کا تصور کرنا بھی نہیں چاہتی تھی۔ وہ لباس پہن کر اٹھی اور دروازہ کھولنے کی کوشش کی۔ لکڑی کا مضبوط دروازہ حسب توقع باہر سے بند تھا۔ وہ زور زور سے دروازہ پیٹنے لگی اور کرب ناک انداز میں مدد کے لئے پکارنے لگی۔

چیخ چیخ کر اس کا گلا بیٹھ گیا۔ بند کھڑکیوں اور دروازے پر مکے برسا برسا کر اس کے نازک ہاتھ زخمی ہو گئے۔ اس کی چوڑیاں ٹوٹ گئیں۔ مگر کوئی آواز آئی اور نہ قرب و جوار میں کوئی آہٹ ابھری۔ اسے یوں لگ رہا تھا کہ کسی ویران علاقے میں واقع یہ ایک وسیع و عریض عمارت ہے۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ اس وقت سیاہ چہرہ ثاقب اس کے سامنے ہو، وہ اسے قتل کر ڈالے اور خود اپنی جان بھی دے دے۔ اس بات میں سویرا کے لئے شک و شبے کی کوئی گنجائش نہیں تھی کہ یہ جو کچھ ہوا ہے، ثاقب کے ایما پر اور اس کی منصوبہ بندی کے تحت ہوا ہے۔ اس کے مجازی خدا نے ذلت و پستی کی تمام حدود کو پھلانگ کر سویرا کو غیر ہاتھوں کے سپرد کر دیا تھا۔

سویرا کے ذہن سے سیاہ غنودگی کی دھند ابھی پوری طرح چھٹی نہیں تھی۔ گرد و پیش اس کی نگاہوں میں گھوم رہے تھے۔ یوں لگتا تھا کہ وہ کافی دیر بے ہوش رہی ہے۔ شاید رات بھر اور آج کا دن بھی سہ پہر تک.......... وہ کمرے میں چکراتی رہی۔ مایوسی اور دکھ کی انتہا کو چھو کر اس نے بڑی سنجیدگی سے خودکشی کا سوچا۔ مگر کسی کام کا ارادہ کرنے اور وہ کام کر گزرنے میں فرق ہوتا ہے۔ سویرا کانپ کانپ گئی۔ دکھ کی شدت سے اس کا

دل جیسے بند ہونے کے قریب تھا۔ نڈھال ہو کر اس نے ایک بار پھر دروازے اور کھڑکیوں پر مکے برسانے شروع کر دیئے۔ اس کی چیخیں گنبد کی آواز کی طرح اس سنگلاخ عمارت کے اندر ہی گونج رہی تھی۔ وحشت میں سویرا نے کئی کھڑکیوں کے شیشے توڑ دیئے۔

شام کے سائے گہرے ہو رہے تھے جب ایک مہربان شکل والی عورت نظر آئی۔ اس کی عمر چالیس کے لگ بھگ ہوگی۔ وہ کھڑکی کی آہنی گرل کی دوسری جانب کھڑی تھی اور خاموشی سے سویرا کو دیکھ رہی تھی۔ سویرا اس پر چلانے لگی۔ وہ پہلے اپنے شدید کرب کا اظہار کرتی رہی اور عورت سے پوچھتی رہی کہ ثاقب کہاں ہے۔ پھر وہ چیخ چیخ کر عورت سے رہائی مانگنے لگی لیکن سویرا کی رہائی عورت کے پاس نہیں تھی‘ وہ اس کے پاس تھی جس نے اسے یہاں قید کیا تھا.......... وہ کون تھا؟ کہاں تھا؟ اب اور کیا چاہتا تھا؟ سویرا کو کچھ معلوم نہیں تھا۔

چیخ چلا کر جب سویرا کا اندرونی غبار آتشیں آنسوؤں کے راستے بہہ گیا تو وہ چادر پوش عورت کھڑکی کے قریب چلی آئی اور بڑے نرم لب و لہجے میں سویرا کو سمجھانے بجھانے لگی۔ عورت کا لہجہ پوٹھوہاری تھا اور انداز سے گہری دانائی جھلکتی تھی۔ اس کی باتوں کا خلاصہ یہ تھا کہ.......... سویرا کے یوں چیخنے چلانے اور رونے دھونے سے کچھ نہیں ہوگا۔ وہ اس وسیع عمارت کے ایک اندرونی کمرے میں ہے‘ جہاں سے اس کی آواز باہر جا ہی نہیں سکتی اور اگر باہر جائے گی بھی تو کون سنے گا؟ یہاں آس پاس کوئی نہیں۔ عورت نے کہا۔ ”میں بھی ایک عورت ہوں اور تمہارے دکھ کو سمجھتی ہوں لیکن اس وقت بہتری اسی میں ہے کہ خود کو سنبھالنے کی کوشش کرو۔ اگر چیخو چلاؤ گی تو یہ لوگ تمہیں اور بھی نقصان پہنچا سکتے ہیں۔“

”یہی تو پوچھ رہی ہوں تم سے؟ یہ کون لوگ ہیں؟“

”اس بارے میں‘ میں تمہیں کچھ نہیں بتا سکتی۔ بس یہ سمجھ لو کہ یہ بڑے طاقت ور اور اختیار والے لوگ ہیں‘ نہ پولیس ان کا کچھ بگاڑ سکتی ہے اور نہ کوئی اور.......... یہ ایک بڑے سرکاری افسر کی حویلی ہے۔ چاروں طرف اس کی زمین ہے۔ امرود‘ آموں اور کینو کے باغ ہیں۔ تم چیخ چیخ کر اپنا گلا بھی پھاڑ لو تو تمہاری فریاد باہر نہیں پہنچے گی۔“

یہ بات کہتے ہوئے عورت کی آنکھوں میں درد کی ہلکی سی پرچھائیں لہرا گئی۔ نہ جانے کیوں سویرا کو لگا جیسے یہ عورت بھی اس چاردیواری میں کسی سنگین آزمائش سے گزر چکی ہے۔ اس کی عمر ڈھل چکی تھی مگر لگتا تھا کہ کسی وقت وہ خوبصورت اور پرکشش رہی ہوگی۔ وہ کسی پنجابی جٹی کی طرح اونچی لمبی تھی اور لباس میں بھی دیہاتی طرز کی جھلک تھی۔

”کیا وہ افسر اس وقت حویلی میں موجود ہے؟“ سویرا نے روتے ہوئے پوچھا۔

”نہیں چلا گیا ہے لیکن اس کے کارندے ہیں۔“

”میں جانتی ہوں وہ حرامی کون ہے.......... میں جانتی ہوں اس کتے کو۔“ سویرا چیخی۔ ”وہ عالم چوہدری ہے۔ اسی نے مجھے برباد کیا ہے۔ میں اسے معاف نہیں کروں گی‘ کبھی معاف نہیں کروں گی۔“ وہ ایک بار پھر سینے کی پوری قوت سے چیخنے لگی۔ ”مجھے بچاؤ.......... میری مدد کرو.......... کوئی ہے.......... کوئی ہے یہاں؟“

اسے وحشت زدہ دیکھ کر عورت کھڑکی سے ہٹ گئی۔

آئندہ دو تین روز میں سب کچھ سویرا پر عیاں ہو گیا۔ اس بات کا پچانوے فیصد امکان تھا کہ وہ ڈپٹی ڈائریکٹر عالم چوہدری کے قبضے میں تھی۔ یہ کوئی مضافاتی علاقہ تھا۔ چاروں طرف کھیت اور درخت وغیرہ تھے۔ یہ ایک پختہ عمارت تھی جو باغات کے بیچوں بیچ واقع تھی۔ نزدیک سے کوئی پختہ سڑک نہیں گزرتی تھی ورنہ سویرا کو گاڑی کی یا ہارن وغیرہ کی آواز سنائی دے جاتی۔ بس کبھی کبھی ایک دور افتادہ آواز ہوا کے دوش پر تیر کر کانوں میں پڑ جاتی تھی‘ یہ ٹریکٹر کی آواز تھی۔ اس حویلی نما عمارت میں چار پانچ کارندے موجود تھے۔ کسی وقت رکھوالی کے کتے کی آواز بھی آتی تھی۔ جو عورت پہلے روز سویرا سے ملی تھی‘ اس کا نام عابدہ تھا۔ اس نے خود کو اس حویلی کی پرانی ملازمہ ظاہر کیا تھا۔ وہ حویلی میں موجود کارندوں کو کھانا وغیرہ پکا کر کھلاتی تھی۔ سویرا کو بھی کھانا عابدہ ہی فراہم کر رہی تھی۔ دو دن پہلے ایک کھڑکی کی جالی پھاڑ کر اور تھوڑی سی گرل توڑ کر فلک شیر نامی ایک کارندے نے اتنی جگہ بنا دی تھی کہ عابدہ باہر ہی سے کھڑے ہو کر کھانے کی ٹرے کمرے میں کھسکا سکتی تھی۔

اڑتالیس گھنٹے تک تو سویرا نے کچھ کھایا پیا نہیں تھا۔ پھر نقاہت سے اسے چکر آنے لگے تھے۔ عابدہ کے بے حد مجبور کرنے پر اس نے ایک دو لقمے لئے اور چند گھونٹ پانی پی لیا......... اس نے کئی بار عابدہ سے ثاقب اور عالم چوہدری کے بارے میں پوچھا تھا۔ مگر عابدہ اتنی کچی نہیں تھی۔ اس نے کہا تھا کہ وہ کسی ثاقب یا عالم کو نہیں جانتی......... ہاں اس حویلی کا مالک یہاں نہیں ہے۔ وہ ایک رات یہاں ٹھہر کر شہر واپس چلا گیا ہے۔ عابدہ نے ایک رات کی بات کی تو سویرا کے دل و دماغ میں پھر تہلکہ مچ گیا۔ گہری سیاہ غنودگی میں لپٹے ہوئے کچھ ناقابل فراموش احساسات اس کے ذہن میں اجاگر ہونے لگے۔ وہ ایسے احساسات تھے جن کے بارے میں وہ سوچنا بھی نہیں چاہتی تھی۔ اس رات کے اس حصے میں وہ ایک ایسے بدترین سانحے سے دوچار ہوئی تھی جو ایک عورت کی زندگی کو انمٹ داغ سے ڈھانپ دیتا ہے۔

رو رو کر وہ تھک جاتی تو کچھ دیر کے لئے نیند کی آغوش میں چلی جاتی۔ دوبارہ آنکھ کھلتی تو سب سے پہلا خیال ذہن میں یہی آتا کہ وہ برباد ہو چکی ہے اور اسے برباد کرنے والا وہ نالی کا کیڑا ہے جسے وہ غلطی سے اپنا شوہر سمجھتی تھی۔ پھر اسے اپنے اہلِ خانہ کا خیال آتا۔ امی، توقیر، پنکی، عدنان، دانش، زلفی......... سب ایک ایک کرکے اس کی نگاہوں کے سامنے آتے اور اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑیاں لگ جاتیں۔ وہ لوگ کیا سوچ رہے ہوں گے......... اسے زندہ درگور کردینے والوں نے اس کے پیاروں کو اس کے بارے میں کیا بتایا ہوگا۔ ثاقب نے اس کی غیر موجودگی کے لئے کیا عذر تراشا ہوگا؟ کیا پتا اپنے ستم کو چھپانے کے لئے سویرا پر ہی کوئی سنگین الزام دھر دیا گیا ہو۔ اس کی روپوشی کو احسن کے ساتھ نتھی کردیا گیا ہو۔ جو لوگ اسے لاہور سے اغوا کرکے اس مضافاتی بستی میں لاسکتے تھے، وہ سبھی کچھ کرسکتے تھے۔

پھر ایک روز سب کچھ سویرا کی برداشت سے باہر ہوگیا۔ وہ لٹ چکی تھی، اب اور لٹنا نہیں چاہتی تھی۔ اس سے پہلے کہ اس چار دیواری میں اس کی بربادی کا سلسلہ دراز ہو، وہ کیوں نہ اپنے آپ کو ختم کرلے؟ یہ خیال اتنی تیزی سے اس کے ذہن میں آیا کہ وہ خود بھی حیران رہ گئی۔ وہ جانتی تھی کہ خودکشی حرام ہے مگر اسے معلوم نہیں تھا کہ اس کی

طرح کے سنگین حالات میں پھنسی ہوئی عورت کے لئے کیا حکم ہوتا ہے۔ ایک پورا دن جان لیوا کشمکش میں گزارنے کے بعد اس نے اپنی دیوانی سوچ کو عملی جامہ پہنا دیا۔ پہلے روز اس نے کھڑکیوں کے جو شیشے توڑے تھے، ان میں سے ایک ٹکڑا اس نے کمرے کے اٹیچ باتھ روم میں رکھا ہوا تھا۔ اس نے کمرے کی بتی بجھائی، بستر پر لیٹی اور بڑی بے دردی سے اپنی بائیں کلائی کی کئی رگیں شیشے کی نوک سے کاٹ ڈالیں۔ تازہ گرم خون کلائی سے نکلنا شروع ہوگیا۔ اس کا دل غم کے ایک پہاڑ تلے دبا ہوا تھا۔ اس نے آنکھیں بند کرلیں۔ اپنے پیاروں کے چہرے تصور میں بسالئے اور موت کا انتظار کرنے لگی۔ دھیرے دھیرے اس کے بدن میں سردی کی لہر اترتی چلی جارہی تھی۔ ایک نقاہت آمیز غنودگی اس کے حواس کو ڈھانپ رہی تھی......... ڈوبتے ذہن کے ساتھ اس نے گاڑی کی آواز سنی۔ پھر کہیں قریب ہی ہارن سنائی دیا۔

☆========☆========☆

دوبارہ اس کی آنکھ کھلی تو اس نے خود کو اسی کمرے میں پایا۔ تاہم اس کا لباس بدل دیا تھا اور بستر پر بھی سفید بے داغ بیڈ شیٹ بچھی ہوئی تھی۔ سویرا کی ایک کلائی پر پٹی بندھی تھی اور وہ ایک گداز تکئے کے سہارے بستر پر نیم دراز تھی۔ پہلی بار کمرے میں اس کے علاوہ کوئی اور شخص بھی موجود تھا۔ وہ ڈپٹی ڈائریکٹر عالم چوہدری تھا۔ بھاری بھرکم مونچھوں کے نیچے اس کے ہونٹوں پر ایک مطمئن مسکراہٹ تھی۔ آج وہ پتلون قمیض میں نظر آرہا تھا۔ اس کا سرخ و سپید چہرہ تمتمایا ہوا تھا اور آنکھوں کی کیفیت سے بھی اندازہ ہوتا تھا کہ وہ نشے میں ہے۔

سگریٹ کا ایک طویل کش لیتے ہوئے اس نے کہا۔ ”جان جی! جو کچھ ہو چکا اسے بھول جاؤ، خود کو سنبھالنے کی کوشش کرو کیونکہ اسی میں تمہاری بہتری ہے اور تمہارے پچھلوں کی بھی۔“

سویرا کے سینے سے غم و غصے کی ایک بلند لہر اٹھی۔ اس کا دل چاہا کہ وہ عالم چوہدری پر جھپٹے اور کم از کم اس کی دونوں آنکھیں تو ضرور نوچ لے۔ شاید اسی ارادے کے تحت اس کے جسم نے تھوڑی سی جنبش بھی کی تھی مگر پھر اچانک اسے احساس ہوا کہ اس کا

دایاں ہاتھ آزاد نہیں ہے۔ اس نے چونک کر دیکھا۔ اس کی کلائی میں ایک دوانچ چوڑا مضبوط اسٹریپ سا تھا۔ ایسے اسٹریپ بعض مریضوں کے لئے اسپتالوں میں استعمال ہوتے ہیں۔ اس اسٹریپ کی مدد سے سویرا کو بیڈ کے ساتھ یوں منسلک کردیا گیا تھا کہ وہ بس بیڈ کے اوپر ہی رہ سکتی تھی۔

اس نے آتشیں نظروں سے عالم چوہدری کی طرف دیکھا۔ وہ نشے کے سبب ہولے سے مسکرایا اور بولا۔ "دیکھو جان جی! ابھی کچھ نہیں بگڑا.......... لاہور میں سب کچھ نارمل ہے۔ میں نے ثاقب کالئے کا ٹرانسفر بڑی دور کرا دیا ہے۔ اب وہ رحیم یار خان میں ہے۔ سب کو یہی معلوم ہے کہ تم بھی اس کے ساتھ رحیم یار خان چلی گئی ہو۔ تمہارے میکے والے تو ثاقب کالئے سے زیادہ ملتے جلتے ہی نہیں تھے۔ ان کو علم ہی نہیں ہو سکے گا کہ تم ثاقب کے پاس ہو یا نہیں۔ کم از کم فوری طور پر تو اس قسم کا کوئی خطرہ نہیں ہے.......... ایسے معاملے بڑے نازک ہوتے ہیں جان جی.......... اور کچھ بھی ہے' ثاقب کالیا بے وقوف بندہ نہیں ہے۔ اس نے جو کچھ کیا ہے بڑی احتیاط سے کیا ہے۔ کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوئی ہے.......... بھئی' تمہاری گمشدگی کی کوئی بات شات نکل جاتی تو سارا معاملہ چوپٹ ہو جاتا تھا۔"

اس نے ٹانگ پر ٹانگ چڑھا کر سگریٹ کے دو طویل کش لئے اور بولا۔ "تم سیانی بیانی لڑکی ہو لیکن یہ جو حرکت تم نے کی ہے ٹھیک نہیں۔ ذرا دماغ سے سوچو' اب اگر اخباروں میں تمہاری خودکشی کی خبر چھپ جاتی تو کیا ہوتا۔ تمہارے گھر والوں پر کیا گزرتی' گلی محلے والے کیا سوچتے' تمہاری بہن پنکی کا کیا بنتا؟"

سویرا دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔ روتے روتے ہی وہ بولی۔ "مجھے مار ڈالو کمینے.......... مجھے موت دے دو.......... موت دے دو۔"

عالم چوہدری کے سکون اطمینان میں کچھ زیادہ فرق نہیں آیا۔ وہ منہ سے چچ چچ کی آواز نکال کر بولا۔ "پھر وہی مارنے اور مرنے کی باتیں۔ پاگلے! یہی تو سمجھا رہا ہوں تجھے۔ خود مر کر اپنے ساتھ دوجوں کو کیوں مار رہی ہے؟ اپنا ہی مت سوچ' اپنے ساتھ ہم سب کا سوچ۔"

اتنے میں عالم چوہدری کے موبائل فون کی گھنٹی بجی۔ کال ریسیو کرنے سے پہلے ہی وہ اٹھ کر باہر چلا گیا۔ باہر نکلتے ہی اس نے کمرے کا دروازہ مقفل کردیا تھا۔

آئندہ دو روز عالم چوہدری اس حویلی نما عمارت میں ہی رہا۔ اس نے دو تین بار چند سیکنڈ کے لئے اپنی صورت دکھائی تاہم اس سے کوئی بات نہیں ہوئی.......... ہاں اس دوران میں عابدہ ضرور کمرے کے اندر آتی رہی۔ اس نے ایک چھوٹی سی چابی کی مدد سے سویرا کی کلائی اسٹریپ کی قید سے آزاد کردی تھی۔ وہ اپنے انداز میں سویرا کو مسلسل سمجھانے کی کوشش کررہی تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ جس جگہ وہ آگئی ہے وہاں سے نکلنا آسان نہیں۔ اس کی بہتری اسی میں ہے کہ وہ خود کو پُرسکون رکھے اور حالات کے مطابق چلنے کی کوشش کرے۔ اسی کی زبانی سویرا کو یہ بھی معلوم ہوا کہ اس دن اتفاقاً ہی عالم چوہدری صاحب وقت پر حویلی پہنچ گئے تھے ورنہ سویرا بند کمرے میں بے ہوش پڑی رہتی اور اس کی کلائی سے خون رس رس کر اسے ختم کر ڈالتا۔

عابدہ کی گفتگو میں جادو اثر کشش تھی۔ نہ صرف یہ کہ وہ دو تین بار سویرا کو کھانا کھلانے میں کامیاب رہی' بلکہ دھکیل دھکیل کر اس نے سویرا کو باتھ روم میں بھی گھسا دیا اور جب وہ نہا کر اور کپڑے پہن کر باہر نکلی تو اس نے سویرا کے بالوں میں کنگھی کی اور پراندہ ڈال کر چوٹی بنا دی۔ اس رات عالم چوہدری اس کے کمرے میں آیا۔ اس کے عقب میں ایک کارندہ تھا جس نے اٹھارہ انچ کا ٹی وی سیٹ اور ایک وی سی پی اٹھا رکھا تھا۔ عالم چوہدری کے حکم پر کارندے نے دونوں چیزیں کمرے میں سیٹ کردیں اور باہر چلا گیا۔

عالم چوہدری ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔ وہ کافی فاصلے پر تھا پھر بھی اس سے سگریٹ اور الکحل کی بو آرہی تھی۔ وہ پاٹ دار آواز میں بولا۔ "تمہیں کچھ دکھانا چاہتا ہوں' میرا خیال ہے کہ تم بھی کچھ چہروں کو بری طرح مس کررہی ہو۔"

سویرا چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔ وہ اطمینان سے مونچھیں مروڑ رہا تھا۔

"جان جی! پریشان کیوں ہوگئی ہو۔ تمہاری اداسی دور کرنے کی کوشش کررہے ہیں۔" اس نے ٹی وی آن کیا اور پھر ویڈیو چلا دیا۔ چند لمحے بعد اسکرین پر جو منظر ابھرا اس نے سویرا پر سکتہ طاری کردیا۔ اس نے عدنان اور زلفی کو دیکھا۔ دونوں شانہ بشانہ شرک

کے کنارے چلے جا رہے تھے۔ دونوں کی پشت پر اسکول بیگ تھے۔ یہ صبح کا وقت تھا۔ ان کے قدم تیزی سے اٹھ رہے تھے کیونکہ انہیں وقت پر اسکول پہنچنا تھا۔ سڑک پر بڑی اور چھوٹی ٹریفک تیزی سے رواں دواں تھی۔ کیمرہ دونوں بچوں کو عقب سے فوکس کر رہا تھا اور بچوں کے ساتھ ساتھ آگے بڑھ رہا تھا۔ اپنے معصوم بھائیوں کو دیکھ کر سویرا سسک اٹھی۔ وہ دونوں باتیں کرتے چلے جا رہے تھے، کبھی کبھی مڑ کر ایک دوجے کو دیکھ بھی لیتے تھے۔ زلفی نے دائیں جانب مانگ نکال رکھی تھی، دائیں جانب مانگ اسے بڑی اچھی لگتی تھی۔ ایسے بال اس نے سویرا کے کہنے پر ہی بنانا شروع کئے تھے۔ سویرا کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ عالم چوہدری نے گمبھیر لہجے میں کہا۔ ''لو بھئی، کر لو تماشا۔ ہم نے تمہیں خوش کرنے کے لئے یہ ویڈیو چلائی تھی، تم نے باقاعدہ رونا شروع کر دیا ہے۔''

سویرا نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بس خاموشی سے ٹی وی اسکرین کو گھورتی رہی۔ عالم چوہدری بولا۔ ''ویسے اس سڑک پر ٹریفک بہت تیز ہے۔ فٹ پاتھ بھی نہیں ہے۔ بچوں کو یوں کنارے کنارے نہیں جانا چاہئے۔ ڈیڑھ دو ہفتے پہلے ٹھیک اسی چوک کے پاس ایک خطرناک ایکسیڈنٹ ہو چکا ہے۔ تیز رفتار ویگن تین بچوں کو کچلتی ہوئی گزر گئی تھی، دو ہلاک ہو گئے تھے اور ایک شدید زخمی ہوا تھا۔''

عالم چوہدری کا لہجہ سن کر سویرا بری طرح چونک گئی۔ اس نے لرز کر عالم کی طرف دیکھا، وہ شہادت کی انگلی سے مونچھیں سہلا رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں وہی چمک تھی جو سویرا نے ایک مرتبہ لاہور کے چڑیا گھر میں ایک ''نوجوان رائل بنگال ٹائیگر'' کی آنکھوں میں دیکھی تھی۔ سویرا کا سارا وجود جیسے ایک دم برف کے بلاک میں لگ گیا تھا۔ عالم چوہدری کی نشیلی آواز جیسے کہیں بہت دور سے اس کے کانوں تک پہنچ رہی تھی۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ''تم نے شاید غور نہیں کیا۔ یہ کیمرہ ایک ٹرک میں رکھا ہے۔ ذرا غور سے دیکھو، ٹرک کا ڈیش بورڈ بھی نظر آ رہا ہے۔ ایک فوم فیکٹری کا یہ ٹرک روزانہ تقریباً اسی وقت یہاں سے گزرتا ہے۔ اکثر ٹرک ڈرائیوروں کی طرح یہ ڈرائیور بھی ''جہاز'' ہی ہے بلکہ ضرورت سے کچھ زیادہ ہی ''جہاز'' ہے۔ ایسے بندے سے کسی بھی وقت کوئی حادثہ ہو سکتا ہے۔ بس ذرا ٹرک سڑک سے نیچے اترا اور.........'' اس نے فقرہ ادھورا

چھوڑ دیا اور منہ سے چچ چچ کی آواز نکال کر مایوسی سے سر ہلانے لگا۔

سویرا کا جسم ایک تنکے کی طرح منہ زور طوفان کی زد میں تھا۔ اسکرین پر عدنان اور زلفی سڑک کے کنارے چلتے چلے جا رہے تھے اور دیو ہیکل ٹرک سست روی سے ان کے پیچھے تھا۔ وہ دونوں معصوم اپنے عقب میں چلنے والی موت سے قطعی بے خبر تھے۔

سویرا نے اپنا چہرہ گھٹنوں میں چھپا لیا اور ہچکیوں سے رونے لگی۔ اس کے رونے کے دوران میں ہی عالم چوہدری نے ٹی وی بند کر دیا تھا اور کمرے سے باہر چلا گیا تھا۔

☆==========☆==========☆

حالات کے تھپیڑوں نے سویرا کو وہ کچھ دکھایا تھا جس کا کبھی اس نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔ اس حویلی میں سویرا کی حیثیت عالم چوہدری کی رکھیل سے زیادہ نہیں تھی۔ وہ ایسی زندگی پر ہزار بار مرنے کو ترجیح دیتی لیکن وہ مر بھی نہیں سکتی تھی۔ عالم چوہدری اس کے اعصاب پر بری طرح سوار ہو چکا تھا۔ ایک روز اس نے نہایت خوفناک لہجے اور بے حد واضح الفاظ میں سویرا کو دھمکی دی تھی کہ اگر اس نے بچے اپنی زندگی سے کھیلنے کی کوشش کی تو اس کا نتیجہ بہت برا نکلے گا۔ یہ کوشش کامیاب ہو یا ناکام لیکن وہ اس کے بہن بھائیوں کی تعداد میں کم از کم دو کی کمی ضرور کر دے گا۔

وہ عالم چوہدری کی خصلت کو بہت اچھی طرح سمجھ گئی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ وہ جنون کی حد تک ہٹ دھرم ہے۔ اپنی ہٹ دھرمی کے دورے میں جو کہتا ہے وہ کر گزرتا ہے۔ اس واقعے کے بعد سویرا نے خود کو ایک بے جان لاشے کی طرح حالات کے دھارے پر چھوڑ دیا تھا۔ وہ اپنے آپ سے بہت دور چلی گئی تھی۔ اپنے جسم سے اس نے خود کو علیحدہ کر لیا تھا، اور اب یہ جسم، جو اس کے بغیر تھا، اس نے عالم چوہدری کے آگے پھینک دیا تھا۔ جیسے کتے کے آگے ہڈی پھینکی جاتی ہے۔

عالم چوہدری ہفتے دس دن بعد حویلی کا چکر لگاتا تھا۔ کبھی ایک دن اور کبھی دو دن رہ کر لاہور واپس چلا جاتا تھا۔ آہستہ آہستہ سویرا کی اطاعت گزاری پر اس کا اعتماد بڑھتا جا رہا تھا۔ پہلے سویرا اس ایک کمرے تک محدود تھی مگر اب اسے حویلی میں گھومنے پھرنے کی آزادی مل گئی تھی۔ یہ کہنے کو تو حویلی تھی مگر اس کی تعمیر شہری عمارتوں کی طرح ہوئی

تھی۔ باہر کی چاردیواری ملا کر یہ عمارت کم و بیش چار کنال میں تھی۔ اس دو منزلہ عمارت میں آٹھ بیڈ روم' دو شاندار کچن اور ایک وسیع ڈرائنگ روم تھا۔ عقب میں باغ کی چاردیواری کے ساتھ سرونٹ کوارٹرز تھے۔ عالم چوہدری کے چار پانچ کارندے ہر وقت اس عمارت میں موجود رہتے تھے۔ سرونٹ کوارٹرز کے ساتھ ایک چھوٹا سا مہمان خانہ تھا۔ اس زیر تعمیر مہمان خانے میں کبھی کبھی وہ افراد آکر ٹھہرتے تھے جو عالم چوہدری کے باغات کا ٹھیکہ لیتے تھے۔

ایک روز عالم چوہدری اپنے کارندوں کے ساتھ جنگلی خرگوش کے شکار پر نکلا تو پہلی بار سویرا کو بھی اس منحوس عمارت سے نکلنے کا موقع ملا۔ ایک بڑی جیپ پر سوار ہو کر وہ لوگ سارا دن خرگوش اور پرندوں کا شکار کرتے رہے۔ سویرا کو یہ سب کچھ پسند نہیں تھا۔ وہ واپس جانا چاہتی تھی۔ مگر عالم نے اس کی پسند و ناپسند کی فکر کب کی تھی جو اب کرتا۔ اس نے مجبور کرکے سویرا کے ہاتھ میں شاٹ گن تھمائی اور اس سے دو فائر کرائے۔

سویرا روہانسا ہوگئی۔ "یہ بات نہیں بھئی' ہنس کے دکھاؤ۔ ورنہ دو فائر اور کرنے پڑیں گے۔"

سویرا نے اپنی جان پر ستم کرکے ہونٹوں پر مسکراہٹ لانے کی کوشش کی اور بولی "لیکن آئندہ مجھے مت کہئے گا ورنہ گولی کے ساتھ ہی میری جان بھی نکل جائے گی۔"

"ٹھیک ہے جان جی۔ نہیں کہیں گے۔ ہمیں تمہاری جان کی ضرورت تو اپنی جان سے بھی زیادہ ہے۔ ویسے بھی تمہیں گولی شولی چلانے کی کیا ضرورت ہے۔ تم تو نظر کے اشارے سے زندگی چھین سکتی ہو۔"

سویرا نے سنی ان سنی کرتے ہوئے گہری سانس لی اور بولی۔ "عالم صاحب! میں واپس جانا چاہتی ہوں۔"

سویرا کا مطلب حویلی واپس جانے سے تھا لیکن عالم جان بوجھ کر بات کو دوسری طرف لے جاتے ہوئے بولا۔ "واپسی کا نام لو گی تو یہ تمہارا ڈپٹی ڈائریکٹر اسی جگہ گر کر دم توڑ دے گا۔ اب واپسی ناممکن ہے جان جی.......... ہمارے لئے بھی اور تمہارے لئے

بھی۔"

مزاح کی شیرینی میں لپٹی ہوئی ایسی تلخ دھمکیاں عالم چوہدری اکثر دیتا ہی رہتا تھا۔

سویرا نے کہا۔ "میں حویلی کی بات کر رہی تھی۔ مجھے معلوم ہے کہ لاہور تو شاید میں مر کر بھی نہ جاسکوں۔"

اس کے ساتھ ہی اس کی آنکھوں میں آتشیں آنسو تیر گئے تھے۔ عالم کے کارندوں سے ان آنسوؤں کو چھپانے کے لئے سویرا نے رخ پھیرلیا۔ عالم اور وہ جیپ کے اندر ہی بیٹھے تھے۔ دوسری جیپ دو شکاری کتوں کے ساتھ خرگوشوں کے تعاقب میں گئی ہوئی تھی۔ عالم چوہدری نے نشست کی پشت کو تیس درجے کے زاویے پر سیٹ کیا اور نیم دراز ہوتے ہوئے بولا۔ "جان جی! تمہارا دل تو سچ مچ چڑی سے بھی چھوٹا ہے.......... اچھا چلو! تم بھی کیا یاد کرو گی' آج تمہاری بات شات کرا دیتے ہیں لاہور میں.......... حویلی جا کر تمہارے گھر ٹیلیفون کرتے ہیں' میرا مطلب جام نگر والے گھر سے ہے۔"

سویرا کی دھڑکنیں ایک دم زیر و زبر ہوگئیں۔ وہ امید بھری نظروں سے عالم کی طرف دیکھنے لگی پھر ایکدم اسے خیال آیا کہ عالم غالباً جھوٹ بول رہا ہے۔ اس کی امی کے خستہ حال گھر میں بھلا فون کہاں ہونا تھا۔

شکرے کی نگاہ والا عالم چوہدری اس کے تاثرات سے اس کے دل کی کیفیت پڑھ لیا کرتا تھا۔ کہنے لگا۔ "شاید تم سوچ رہی ہو کہ تمہارے گھر ٹیلیفون کہاں سے آگیا۔ میری جان' آگیا ہے ٹیلیفون۔ باقاعدہ آگیا ہے اور اس کے علاوہ بھی کئی چیزیں آگئی ہوں گی۔ تمہارا بھائی توقیر اب ماشاء اللہ سرکاری ملازم ہے.......... میں نے اس کا ٹرانسفر اپنے آس پاس ہی کرا لیا ہے۔ اب وہ خوب مزے میں ہے۔"

شکار کے بعد حویلی واپس جاتے ہوئے سویرا مسلسل سوچتی رہی.......... کیا واقعی حویلی جا کر عالم اس کی بات اپنے ماں جائیوں سے کرا دے گا۔ کیا واقعی جام نگر کے اس گھر میں خوش حالی کی وہ لہر موجود ہے جس کی راہ دیکھتے دیکھتے سویرا ایک ننھی بچی سے عورت بن گئی تھی.......... حویلی پہنچنے کے تھوڑی ہی دیر بعد عالم چوہدری اپنا موبائل لے کر اس کے پاس پہنچ گیا۔ اس کے چہرے سے مزاح رخصت ہو چکا تھا اور آنکھوں میں گہری

سنجیدگی کروٹ لے رہی تھی۔ وہ تحکمانہ لہجے میں بولا۔ "تم یہی ظاہر کرو گی کہ رحیم یار خان میں اپنے شوہر ثاقب کالئے کے گھر میں موجود ہو۔ ثاقب دفتر گیا ہوا ہے۔ تم اس کی اجازت سے کسی قریبی پی سی او سے فون کر رہی ہو۔ ثاقب نے تمہیں اجازت دی ہے کہ مہینے میں ایک آدھ بار فون کرلیا کرو۔ گھر کا پتا بتانے سے گریز کرنا اور کہنا کہ ابھی ثاقب نے منع کر رکھا ہے۔"

ضروری ہدایات دینے کے بعد اس نے نمبر ملایا اور فون سویرا کے حوالے کر دیا۔

زلفی کی چہکار سویرا کے کانوں میں گونجی اور اس کے دل کے قبرستان میں ایک دم سینکڑوں شادیانے بج اٹھے۔ وہ توتلی زبان میں۔ "ہیلو توں.......... ہیلو توں؟" کہتا جا رہا تھا۔

سویرا نے بے اختیار ماؤتھ پیس کو چوما اور رندھی ہوئی آواز میں بولی۔ "میں تمہاری آپی بول رہی ہوں.......... آپی سویرا۔"

دوسری طرف چند سیکنڈ خاموشی رہی پھر زلفی کی چیختی ہوئی آوازیں سنائی دیں' وہ باقی اہلِ خانہ کو پکار رہا تھا اور انہیں سویرا کے فون کی اطلاع دے رہا تھا۔

اس روز سویرا نے عرصے بعد اپنے گھر والوں سے باتیں کیں اور دل کھول کر آنسو بہائے۔ بہرحال یہ ساری گفتگو عالم چوہدری کی ہدایات کے مطابق ہی ہوئی تھی۔

☆=========☆=========☆

اس واقعے کے بعد کبھی کبھی فون پر اس کی بات اپنے گھر والوں سے ہونے لگی۔ وہ سب خوش تھے اور سویرا کا حال چال پوچھتے تھے۔ سویرا انہیں بتاتی تھی کہ وہ بھی بہت خوش ہے۔ ثاقب اب قدرے ٹھیک ہو گئے ہیں اور اسے بڑے اچھے طریقے سے رکھا ہوا ہے' وغیرہ وغیرہ۔

گھر والے اس کی شکل دیکھنے کو ترسے ہوئے تھے' ننھا زلفی تو اکثر رونے لگتا تھا۔ سویرا ہر بار اسے تسلی دیتی تھی۔ پنکی کی چند ماہ میں شادی ہونے والی تھی۔ ایک مناسب جگہ پر اس کا رشتہ ہو گیا تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ شادی سے پہلے ایک مرتبہ سویرا ضرور لاہور آئے۔ اس کے پاس سویرا کے لئے ڈھیروں ڈھیر باتیں جمع ہو گئی تھیں اور وہ ان باتوں کے بوجھ تلے دبی جا رہی تھی۔ پھر ایک دن تو وہ بھی زلفی کی طرح فون پر رونے لگی تھی۔ کہنے

لگی تھی۔ "لگتا ہے کہ آپ توقیر بھائی سے ناراض ہیں۔ اگر آپ ناراض ہیں تو اس کی سزا ہمیں کیوں دے رہی ہیں۔ آپ نے پلٹ کر دیکھا تک نہیں ہمیں۔"

"میں تو خود سزا کاٹ رہی ہوں میری بہن.......... میں تو.........."

شاید وہ کچھ اور بھی کہہ جاتی مگر سامنے صوفے پر بیٹھے عالم چوہدری نے گھور کر اسے دیکھا اور اس نے فوراً بات بدل دی تھی۔ فون کال کے دوران عالم مسلسل سویرا کے قریب موجود رہتا تھا۔

سویرا نے کبھی عالم کو نہیں بتایا تھا کہ ہر بار زلفی فون پر روتا ہے اور اس سے ملنے کا تقاضا کرتا ہے۔ وہ جانتی تھی اگر وہ ایسی باتیں عالم کو بتائے گی تو اس بات کا خطرہ پیدا ہو جائے گا کہ کہیں وہ اس "ٹیلی فونک رابطے" پر ہی پابندی نہ لگا دے۔ بہرحال وہ موقع محل دیکھ کر تھوڑا تھوڑا عالم سے کہتی رہتی تھی کہ وہ امی اور بہن بھائیوں کی صورت دیکھنا چاہتی ہے۔ عالم ایسے موقعوں پر "ہاں" میں جواب دیتا تھا اور نہ ہی "نہ" میں۔

سویرا جانتی تھی کہ اگر کسی وقت عالم چوہدری نے اس کی ملاقات اس کے گھر والوں سے کرا بھی دی تو وہ عالم کے لئے کوئی خطرہ نہیں بنے گی۔ شاید اپنے صیاد کے لئے خطرہ بننے کی صلاحیت ہی اس کے اندر ختم ہو گئی تھی۔ عالم اپنی تمام تر سفاکی اور عیاری کے ساتھ اس کے دل و دماغ پر حاوی ہو چکا تھا۔ وہ ذہنی' جسمانی' نفسیاتی ہر سطح پر اس کے نیچے دب چکی تھی۔ ٹوٹ پھوٹ کر مسخ ہو گئی تھی۔ اب کسی وقت ٹاؤن افسر ثاقب بشیر کا خیال اس کے ذہن میں آتا تھا تو وہ اسے عالم چوہدری کے سامنے بالشتیا محسوس ہوتا تھا۔ وہ یہ سوچ کر دکھ آمیز حیرانی میں ڈوب جاتی تھی کہ وہ اور اس کے گھر والے ایک بالشتیے سے اس قدر مرعوب ہو گئے تھے۔

ایک دو دن حویلی میں رہ کر عالم چوہدری چلا جاتا تھا۔ ایک بار پھر حویلی کی پتھریلی دیواریں ہوتی تھیں اور سویرا ہوتی تھی۔ بس وہی گھسی پٹی چند شکلیں اور وہی لگی بندھی چند آوازیں.......... کہیں دور سے آنے والی ٹریکٹر یا تھریشر کی آواز' باغوں میں پرندے اڑانے کے لئے جو کنستر بجائے جاتے تھے ان کی آواز' حویلی کے احاطے میں سفیدے کے بلند درختوں سے گزرنے والی ہوا کی آواز اور رکھوالی کے کتوں کی آواز.......... قریباً پانچ

ماہ گزرنے کے باوجود اسے ابھی تک یہ معلوم نہیں ہو سکا تھا کہ وہ کس علاقے میں ہے۔ بس اتنا اندازہ تھا کہ یہ جگہ لاہور سے بہت زیادہ دور نہیں ہے۔ حویلی کے کام کاج سے فارغ ہو کر عابدہ اکثر اس کے پاس آبیٹھتی تھی' وقت گزاری کے لئے وہ دیر تک باتیں کرتی رہتیں۔ باتوں باتوں میں سویرا' عابدہ سے ٹوہ لینے کی کوشش کرتی اور اپنے ذہن میں کلبلانے والے سوالوں کا جواب ڈھونڈتی مگر اس معاملے میں عابدہ بے حد محتاط اور کایاں تھی۔ وہ ہر لفظ تول تول کر بولتی تھی اور کوئی غیر ضروری بات منہ سے نہیں نکالتی تھی۔ سویرا نے اندازہ لگایا تھا کہ عابدہ کا یہ انداز کڑی تربیت کا نتیجہ ہے۔ ممکن ہے کہ ماضی میں اس حوالے سے اس نے کوئی غلطی یا غلطیاں کی ہوں اور نتیجے میں اسے مار پیٹ کا شکار ہونا پڑا ہو یا پھر کسی اور تادیبی کارروائی کا سامنا کرنا پڑا ہو۔ بہرحال اب وہ اس حوالے سے ٹرینڈ تھی۔

عابدہ نے ٹکڑوں میں اسے جو آپ بیتی سنائی تھی اس کا خلاصہ یہ تھا کہ اٹھارہ بیس سال پہلے عابدہ کی شادی اس گاؤں میں ہوئی تھی جہاں کا رہائشی عالم چوہدری تھا۔ عالم چوہدری کا بڑا بھائی مختار چوہدری گاؤں کا نمبردار تھا اور سربراہ بھی۔ عابدہ کے شوہر نے اپنی دو بہنوں کی ایک ساتھ شادی کی اور اس موقع پر نمبردار مختار چوہدری سے قرض لیا.........

تین چار سال تک مسلسل کوشش کرنے کے باوجود وہ غریب کاشتکار یہ قرض نہ اتار سکا اور سود در سود یہ رقم ساٹھ ہزار تک پہنچ گئی۔ پندرہ سولہ سال پہلے ساٹھ ہزار بھی بہت بڑی رقم تھی۔ نمبردار کے تقاضے بڑھتے گئے۔ پہلے عابدہ کے شوہر کے ڈھور ڈنگر نمبردار کے قبضے میں گئے۔ پھر ان کے گھر کے برتن اور دیگر سامان پھر گھر والوں کی باری آگئی۔ عابدہ اور اس کی ساس حویلی میں کام کاج کرنے لگیں اور پھر رہنے بھی وہیں لگیں۔ نمبردار مختار چوہدری نے عابدہ کے شوہر اکمل کو سمجھا دیا تھا کہ اب وہ اپنی ماں اور بیوی کو اسی وقت حویلی سے لے جا سکے گا جب قرضہ اتار دے گا۔ اکمل روتا پیٹتا چلا گیا۔ کچھ لوگوں نے بتایا کہ محنت مزدوری کرنے کے لئے کراچی گیا ہے لیکن وہ ایسا گیا کہ پھر پلٹ کر ہی نہیں آیا۔ اب یہ علم نہیں کہ مرگیا یا بھول گیا۔ کچھ عرصے بعد عابدہ کی ساس بھی بیمار ہو کر چل بسی۔ جواں سال عابدہ حویلی میں اکیلی رہ گئی۔ نمبردار مختار ایسا شریف بندہ تو نہیں تھا

لیکن وہ ایسا خطرناک بھی نہیں تھا' جیسا عالم تھا۔ جب تک تو مختار حویلی میں رہا' عابدہ کی آبرو محفوظ رہی لیکن جب مختار اپنے علاج کے لئے لندن چلا گیا اور پھر وہیں اس نے اپنا چاولوں کا کاروبار شروع کردیا تو عابدہ مکمل طور پر عالم چوہدری کے قبضے میں آگئی۔ اس کے ساتھ وہی ہوا جو ہونا چاہئے تھا' وہ عالم چوہدری کا کھلونا بن گئی اور یہ کوئی پہلا واقعہ نہیں تھا۔ اس سے پہلے درحقیقت پختہ عمر عالم چوہدری نے ابھی تک شادی نہیں کی تھی۔ اس کا گزارہ اسی طرح چل رہا تھا۔

عابدہ اب ایک بھولی بسری کہانی بن چکی تھی۔ اس کا جسم فربہ ہو چکا تھا۔ پچھلے دو چار برسوں سے وہ دمے کی مریضہ بھی تھی۔ عالم چوہدری کے لئے اب اس میں مطلق کشش نہیں رہی تھی۔ اب اس کا یہی مصرف رہ گیا تھا کہ وہ حویلی کا کام کاج کرے اور کارندوں کی روٹیاں پکائے۔ اس کی حیثیت اب اس پنچھی کی سی تھی جو پنجرے کو ہی گھر سمجھ بیٹھتا ہے......... عابدہ کی زبانی سویرا کو عالم اور اس کے ساتھیوں کی سفاکیوں کی جو کہانیاں معلوم ہوئی تھیں' انہوں نے سویرا کے اعصاب کو بالکل ہی توڑ پھوڑ دیا تھا اور سویرا جانتی تھی' وہ کہانیاں جھوٹی نہیں ہیں۔

کسی وقت شام کے ڈھلتے سایوں میں جب سویرا تنہا بیٹھی ہوتی تو نہ جانے کیوں خود کو لعنت ملامت کرنے لگتی۔ وہ سوچتی وہ اتنی کم حوصلہ کیوں ہے۔ وہ کیوں ثاقب کی مزاحمت نہ کرسکی اور اب کیوں عالم چوہدری کی مزاحمت نہیں کرسکتی؟ وہ پڑھی لکھی ہے' کیوں اس کے دماغ میں یہ خیال نہیں آتا کہ وہ قانون کی مدد حاصل کرے' کسی طرح یہاں سے بھاگنے کی کوشش کرے یا چھٹکارے کا کوئی اور راستہ اختیار کرے.........؟ کیا وہ کسی اخبار کے دفتر میں نہیں پہنچ سکتی۔ کیا وہ لاچاروں کی امداد کرنے والی کسی لیگل ایڈوائزری سے رابطہ نہیں کرسکتی؟ جب وہ پوری توجہ سے ایسے سوالوں کا جواب ڈھونڈنے کی کوشش کرتی تو نہ جانے کیوں......... اس کی نگاہوں کے سامنے ایک بھری پری سڑک آجاتی......... اور اس سڑک کے کنارے چلتے دو معصوم بچے آجاتے اور وہ چمک یاد آجاتی جو اس نے برسوں پہلے رائل بنگال ٹائیگر کی آنکھوں میں دیکھی تھی۔

ایک روز وہ نہا کر باتھ روم سے نکلی تو ناک پر چھوٹی سی پھنسی کا احساس ہوا۔ وہ

اس پھنسی کو دیکھنے کے لئے ہی آئینے کے سامنے آئی تھی ورنہ اسے اپنی صورت دیکھے مہینوں گزر چکے تھے۔ غیرارادی طور پر اس کی نگاہ اپنے سراپے پر پڑی۔ اس نے شلوار قمیض پہن رکھی تھی‘ بال شانوں پر بکھرے تھے۔ خود کو دیکھ کر اسے تھوڑا سا تعجب ہوا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ دن بدن مرجھاتی چلی جارہی ہے‘ اس کے چہرے سے پاکیزگی کی چمک کھرچی جاچکی ہے اور ملامتوں نے اس کے لب و رخسار پر ڈیرا ڈال رکھا ہے لیکن آئینہ دیکھ کر اس نے محسوس کیا کہ ایسا کچھ نہیں ہے۔ شاید وہ ویسی ہی ہے جیسی پہلے تھی۔ اسے اپنا آپ اچھا نہیں لگا تو برا بھی نہیں لگا۔ ایسا کیوں تھا.......... شاید اس لئے تھا کہ اس کے ساتھ جو کچھ ہو رہا تھا‘ وہ اس سے یکسر الگ ہو چکی تھی۔ اس نے اپنے دل و دماغ اور احساسات کو کلی طور پر اپنے لاچار جسم سے علیحدہ کرلیا تھا۔ لہٰذا سب کچھ ہونے کے باوجود معصومیت اس سے چھنی نہیں تھی جو اس کے وجود کا حصہ تھی۔

اس نے اپنے سراپے پر غور کیا اور اسے اندازہ ہوا کہ اگر وہ خود کو بری نہیں لگی تو شاید اس کی ایک وجہ اور بھی تھی۔ آج اس نے ”ویلوٹ“ کا جو سوٹ پہن رکھا تھا‘ اس کے رنگ سیاہ اور براؤن تھے۔ اس کے بال بھی شانوں پر بکھرے ہوئے تھے۔ اس کا یہی روپ تو تھا جو کسی کو بہت پیارا تھا۔ آنکھوں کے راستے کسی کے دل میں سما گیا ہوا تھا.......... آج اس کے روپ کو سراہنے والا کہاں تھا؟ کس بستی میں‘ کس شہر میں تھا؟ اسے یاد بھی کرتا تھا یا نہیں؟ اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ اس نے اپنے دل کو ٹٹولا اور اسے اندازہ ہوا کہ وہ کبھی بھی احسن کو بھولی نہیں ہے۔ اس کو ہمیشہ یاد کرتی رہی ہے۔ کبھی اسے اپنی اس کیفیت کا ادراک ہوتا رہا ہے‘ کبھی نہیں.......... وہ بالوں کو سمیٹتی ہوئی باہر چلی آئی۔

باہر ایک سہانی شام تھی۔ دن بھر کی تمازت کے بعد خوش گوار ہوا چل رہی تھی۔ ایسی ہی شامیں جام نگر کی زندگی میں رنگ بھر دیا کرتی تھیں۔ وہ ان رنگوں کو دیکھنے اور اپنے اندر سمونے کے لئے بے اختیار چھت پر چلی جایا کرتی تھی۔ شاید اسی لئے اس شام احسن اسے ٹوٹ کر یاد آیا۔ وہ جانتی تھی کہ احسن کو یاد کرنے کا اب اسے کوئی حق نہیں لیکن وہ پھر بھی یاد کررہی تھی‘ ایک ایک بات‘ ایک ایک واقعہ.......... کچھ اس شعر جیسا

حال تھا۔

ولڑی اداس گنیری اے۔
اج سک متراں دی ودھیری اے۔
اج اکھیاں لائیاں کیوں جھڑیاں۔

ایک عجیب سا گداز اس کے دل میں جاگ رہا تھا۔ نکھری ہوئی فضا میں کوئی رس بھرنے والا نغمہ گونجنے لگا تھا۔ اچانک گاڑی کی آواز آئی اور عالم مین دروازے سے اندر آگیا۔ پورچ میں ایک کارندے نے بھاگ کر اس کی جیپ کا دروازہ کھولا۔ وہ نشے میں تھا‘ ڈگمگاتا ہوا سویرا کی طرف بڑھا اور بے باکی کے ساتھ اسے بغل میں لے کر اندرونی حصے کی طرف بڑھ گیا۔ سویرا کے تمام لطیف احساسات یوں ہوا ہوئے جیسے گرما کے سورج سے جھلس کر شبنم ناپید ہوتی ہے اور یہ کوئی پہلی مرتبہ نہیں تھا۔ عالم کی آمد سویرا کی نازک خیالی پر اکثر ایسے ہی شب خون مارا کرتی تھی۔

اس رات جب عالم چوہدری نشے میں چُور سویرا کے قریب نیم دراز تھا۔ سویرا نے کہا۔ ”عالم صاحب! آپ مجھ سے شادی کیوں نہیں کرلیتے۔ میں.......... اس گناہگار زندگی کا بوجھ مزید نہیں اٹھا سکتی۔“

”جان جی! میں نے پہلے بھی تمہیں بتایا تھا نکاح پر نکاح نہیں ہوسکتا۔ وہ حرام کا تخم کالیا تمہیں طلاق دے گا تو میں شادی کروں گا نا۔ پہلے تو وہ لالچی باپ کا پتر مانتا ہی نہیں تھا۔ اب مانا تو ہے لیکن اس کا کھوج کھرا نہیں مل رہا۔ میں نے بندہ بھیج کر رحیم یار خان سے پتا بھی کرایا ہے‘ وہ ڈیڑھ مہینے کی چھٹی پر ہے۔ سنا ہے وہاں بھی کوئی گھپلا کرکے بھاگا ہوا ہے۔ وہ آثارِ قدیمہ والا فاروق لنگڑا پرانی بدروح کی طرح اس سے چمٹا ہوا ہے‘ وہی اس کا بیڑا غرق کررہا ہے۔“

عالم چوہدری اور نہ جانے کیا کیا باتیں بناتا رہا۔ سویرا اس کی باتیں سنتی رہی اور دل ہی دل میں روتی رہی۔ وہ جانتی تھی یہ سب باتیں جھوٹ ہیں۔ عالم اس کو بیوی کی حیثیت دینا ہی نہیں چاہتا۔ بس اسی طرح رکھنا چاہتا ہے‘ جس طرح رکھا ہوا ہے۔ شاید پھر کسی دن اسے بھی عابدہ کے ساتھ مل کر عالم کے کارندوں اور مہمانوں کی روٹیاں پکانا پڑیں گی۔ یہ

شک تو اسے بہت پہلے سے تھا کہ شادی کے حوالے سے عالم اس سے جھوٹ بول رہا ہے مگر دس بارہ روز پہلے اس کا یہ شک یقین میں بدل گیا تھا۔ ایک اتفاق کے تحت عالم کی ذاتی الماری کے اندرونی خانے میں رکھے ہوئے کچھ کاغذات سویرا کی نگاہ میں آ گئے تھے۔ ان کاغذات کے اندر وہ طلاق نامہ بھی موجود تھا جو تقریباً ایک سال پہلے ثاقب نے سویرا کو دیا تھا۔ ثاقب کی طرف سے سویرا کو طلاق ہو چکی تھی۔

دن گزرتے رہے۔ عالم دھیرے دھیرے سویرا پر اعتماد کرنے لگا تھا۔ اس کی تیز نگاہ بھانپ چکی تھی کہ اب پنجرے کے ماحول نے پنچھی کے پروں سے پرواز کی طاقت چھین لی ہے.......... وہ نفسیاتی طور پر سویرا پر پوری طرح حاوی ہو چکا تھا' یہی وجہ تھی کہ وہ ایک دن سویرا کو لاہور اس کے گھر والوں سے ملوانے بھی لے گیا۔ یہ دیدہ دلیری کی قابلِ ذکر مثال تھی۔

سویرا کے پہنچنے سے پہلے ہی عالم نے رحیم یار خان سے سویرا کے گھر فون کرا دیا تھا۔ یہ فون ثاقب نے ہی کیا تھا۔ کم از کم سویرا کے گھر والوں کو تو وہ ثاقب کی آواز ہی لگی تھی۔ ثاقب نے اس بات پر بڑے افسوس کا اظہار کیا تھا کہ کچھ ناگزیر وجوہات کے سبب وہ سویرا کو پنکی کی شادی پر نہیں لا سکا.......... وہ اب بھی آ نہیں سکتا۔ بہرحال سویرا ایک ملازم کے ساتھ آئے گی اور ان لوگوں سے مل جائے گی۔

عالم چوہدری نے ایک سفید ریش ملازم خانو کے ساتھ سویرا کو جام نگر بھیجا تھا۔ خانو سویرا کو بیٹی کہہ کر پکارتا تھا۔ جس گاڑی پر وہ لوگ جام نگر گئے تھے' اس پر رحیم یار خان کا نمبر لگا ہوا تھا۔ گاڑی کا ڈرائیور بھی شکل و صورت سے جنوبی پنجاب کا ہی لگتا تھا۔ سویرا ایک دن اور ایک رات اپنے گھر رہی تھی۔ یہ چوبیس گھنٹے چٹکی بجاتے اڑ گئے تھے۔ اتنی باتیں تھیں' اتنے آنسو تھے' اتنا پیار تھا کہ اس ایک دن کا کچھ پتا ہی نہیں چلا تھا۔ پنکی اور اس کا دولہا بھی گھر میں موجود تھے۔ سویرا کی شدید خواہش کا احترام کرتے ہوئے ان دونوں نے سویرا کو ایک بار پھر دس روز پہلے کی طرح دولہا دلہن بن کر دکھایا تھا۔ سویرا نے جذبات سے بے قابو ہو کر پنکی کو گلے لگا لیا تھا اور رو رو کر نڈھال ہو گئی تھی۔

زلفی تو شاید اس کی گود سے اترا ہی نہیں تھا.......... باقی بہن بھائی بھی مستقل اس

سے چمٹے ہوئے تھے۔ سویرا نے اشک بار آنکھوں سے توقیر کو دیکھا تھا اور بولی تھی۔ ”توقیر بھائی! اب تو خوش ہیں نا آپ.......... اب میں لڑ کر نہیں آئی ہوں' اب میں آپ سب پر بوجھ نہیں ہوں۔“

توقیر بس الجھی الجھی نظروں سے دیکھتا رہا تھا۔ ایسا ہی الجھاؤ سویرا کو امی کی پیار بھری نظروں میں بھی نظر آیا تھا۔ شاید ان دونوں کو شبہ تھا کہ حالات بعینہٖ ویسے نہیں ہیں جیسے سویرا انہیں بتا رہی ہے۔ بہرحال سویرا کو زیادہ کریدنے اور آزردہ کرنے کا رسک کوئی نہیں لے رہا تھا اور شاید اس کا موقع بھی نہیں تھا۔ سفید ریش خانو سائے کی طرح سویرا کے ساتھ تھا۔

چوبیس گھنٹے بعد سویرا پھر آنے کا وعدہ کر کے آہوں اور سسکیوں کے درمیان گھر سے رخصت ہو گئی تھی۔ وقتِ رخصت پنکی نے چپکے سے سویرا کے کان میں کہا تھا۔ ”آپ کو احسن بھائی کے بارے میں کچھ پتا ہے؟“

”کیا ہوا؟“ سویرا کا دل دھک سے رہ گیا۔

”انہوں نے نشہ چھوڑ دیا ہے.......... بالکل بدل گئے ہیں۔ انہوں نے اپنا ذاتی کام شروع کر دیا ہے.......... آپ کو پتا ہے' ان کا انعامی بانڈ نکلا ہے۔“

پنکی کچھ اور بھی بتانا چاہتی تھی مگر سویرا نے سر جھٹک دیا۔ ”پلیز پنکی! اس بارے میں مجھے کچھ نہ بتاؤ۔“

پھر سب کو سوگوار چھوڑ کر وہ خانو بابا اور ڈرائیور کے ساتھ چلی گئی تھی۔ بظاہر وہ رحیم یار خان روانہ ہوئی تھی مگر وہ رحیم یار خان نہیں جا رہی تھی' وہ لاہور سے تقریباً پچاس ساٹھ میل دور رینالہ خورد کے ایک نواحی دیہہ جوت گڑھ کی طرف جا رہی تھی.......... اسی حویلی میں جہاں اسے وقت نے اسیر کر رکھا تھا۔

☆=========☆=========☆

وقت اسی طرح گزرتا رہا۔ دن اور رات ایک دوسرے کے تعاقب میں رہے۔ سردیوں کا آغاز ہو چکا تھا۔ وہ ایک ابر آلود رات تھی۔ دو دن سے عالم حویلی میں موجود تھا۔ شام ہوتے ہی بارش شروع ہو گئی تھی اور اب حویلی کی چھتوں پر مسلسل پانی برس رہا

تھا۔ رات گیارہ بجے کے قریب سویرا کچی نیند سے بیدار ہوئی۔ خواب گاہ کی بتی جل رہی تھی اور عالم جلدی جلدی شب خوابی کا گاؤن اتار کر شلوار قمیض پہن رہا تھا۔ سویرا نے خمار آلود آواز میں پوچھا۔ ”کیابات ہے‘ کہاں جارہے ہیں؟“

”کہیں نہیں.......... ایک دو مہمان آئے ہیں۔ تم سو جاؤ۔“ عالم نے جلدی سے کہا۔

اس کے لہجے میں کچھ مختلف بات تھی۔ نیند کے خمار میں سویرا نے عالم کے لہجے پر زیادہ غور نہیں کیا۔ وہ شاید کچھ اور بھی پوچھتی مگر عالم کا انداز دیکھ کر اسے ہمت نہیں ہوئی۔ وہ عالم سے اس قدر مرعوب ہو چکی تھی کہ اس سے مخاطب ہونے سے پہلے وہ بار بار بات کو تولتی تھی اور اتنی بار تول کر بھی اکثر چپ ہی رہتی تھی۔

وہ کروٹ بدل کر سوگئی.......... دوبارہ اس کی آنکھ غالباً ایک گھنٹے بعد کھلی تھی۔ کسی قریبی کمرے سے اسے بولنے کی زور دار آوازیں آئی تھیں۔ باہر گرج چمک کے ساتھ بارش ہو رہی تھی۔ سویرا بستر پر لیٹی رہی اور ان آوازوں کو سمجھنے کی کوشش کرتی رہی۔ اسے اندازہ ہوا کہ عالم کسی پر بری طرح گرج برس رہا ہے اور شاید مار پیٹ بھی کررہا ہے۔ ایسی آواز کا آنا یہاں کوئی اچنبھے کی بات نہیں تھی۔ سویرا نے پھر کروٹ بدل کر سونے کی کوشش کی لیکن آوازوں نے اسے چونکا دیا تھا۔ اسے لگا شاید ایک سے زائد افراد گرج برس رہے ہیں۔ وہ تجسس سے مجبور ہو کر اٹھی اور دبیز قالین پر ننگے پاؤں چلتی ہوئی راہداری میں آگئی۔ آوازیں اسی کمرے سے آرہی تھیں جو ڈرائنگ روم سے ملحق تھا۔ اس طرف جانے کا راستہ ایک مقفل دروازے نے روک رکھا تھا۔ سویرا دراز سے چابی نکال لائی اور دروازہ کھول کر ایک تاریک کوریڈور میں پہنچ گئی۔ آوازیں اب واضح ہوگئی تھیں۔ سویرا نے کھڑکی کی ایک درز سے اندر جھانکا اور بھونچکی رہ گئی۔ اسے اپنی نگاہوں پر بھروسا نہیں ہوا۔ اندر واقعی مار پیٹ ہو رہی تھی لیکن یہ مار پیٹ عالم چوہدری نہیں کررہا بلکہ یہ عالم چوہدری سے ہو رہی تھی۔ وہ قالین پر گرا ہوا تھا۔ ایک شخص نے اس کی پسلیوں پر ٹھوکر ماری۔ عالم چوہدری نے ہاتھ جوڑ دیئے اور گھگیانے لگا۔ مارنے والے نے عالم کو سر کے بالوں سے پکڑ کر اٹھایا اور دیوار سے لگا کر بے دریغ دو زناٹے کے تھپڑ

عالم کے رخساروں پر مارے‘ پھر دھکا دے کر اسے پیچھے ہٹا دیا۔

عالم کا سرخ چہرہ شرم‘ ندامت اور تھپڑوں سے سرخ تر ہو گیا تھا۔ وہ چند لمحے ساکت کھڑا رہا پھر جلدی سے آگے بڑھا اور مارنے والے کے پاؤں پکڑ لئے۔ وہ معافی مانگ رہا تھا۔ مارنے والا ابھی تک غصے میں بھرا ہوا تھا وہ جا کر صوفے پر بیٹھ گیا۔ عالم اپنی جگہ کھڑا رہا اور صفائی پیش کرنے والے انداز میں بولتا رہا۔

”میں خدا کی قسم کھاتا ہوں جلالی صاحب! مجھے پتا نہیں تھا کہ وہ واقعی آپ کا بھتیجا ہے۔ میرا خیال تھا کہ کوئی یار دوست ہے اور آپ نے رسمی سفارش کی ہے۔ میں نے تو..........“

”اوئے کتی کے پتر‘ کیا ضروری تھا کہ وہ اپنا شجرہ نسب ساتھ لے کر آتا۔ جب میں نے تجھے فون پر بتا دیا تھا کہ وہ میرا بھتیجا ہے‘ پھر جو خط میری طرف سے آیا تھا اس میں بھی لکھا تھا کہ جمشید میرے بھائی کا بیٹا ہے.......... پھر یہ حرام زدگی کیوں کی تُو نے؟“

”میں ہاتھ جوڑ کر معافی چاہتا ہوں جلالی صاحب! میں قسم کھاتا ہوں..........“

”تُو بکواس کرتا ہے۔“ دوسرے شخص نے ایک بار پھر چیخ کر عالم کی بات کاٹی۔ ”تیرے گندے دماغ میں افسری کا کیڑا رینگنے لگا ہے۔ وہ وقت بھول گیا ہے تو جب کتے کی طرح میرے پیچھے دم ہلاتا پھرتا تھا۔ ایک اے ایس آئی کی نوکری کے لئے تو کسی کے پاؤں چاٹنے کے لئے بھی تیار تھا۔ آج ڈپٹی ڈائریکٹر کی کرسی پر بیٹھا ہے تو بندے کیڑے مکوڑے نظر آنے لگے ہیں تجھے.......... میں تیری یہ حرامی آنکھیں ہی پھوڑ دوں گا جن میں چربی اتری ہوئی ہے۔“

عالم نے ایک بار پھر ہاتھ جوڑ دیئے۔ ”بس جلالی صاحب! مجھے ایک موقع اور دے دیں صرف ایک موقع.......... میں ابھی اسی وقت لاہور چلا جاتا ہوں۔ صرف ایک دن میں‘ میں سب ٹھیک کرلوں گا۔ اگر نہ کروں تو جو چور کی سزا وہ میری۔“

دوسرا شخص کچھ دیر تک قہرناک نظروں سے عالم کو گھورتا رہا۔ پھر انگلی اٹھا کر بولا۔ ”ایک بات یاد رکھنا.......... وہاں پلازہ بننا ہے اور ضرور بننا ہے اور جتنا کام وہاں ضائع ہوا ہے‘ اس کا ہرجانہ بھی تجھے ہی دینا ہے.......... اور جو کچھ میں کہہ رہا ہوں اسے اپنی ڈائری

میں پکی سیاہی سے نوٹ کر لے۔"

قرب و جوار سویرا کی نگاہوں میں گھوم رہے تھے۔ وہ اپنے کمرے میں واپس آگئی اور بستر پر گر کر اپنے چکراتے ذہن کو سنبھالنے کی کوشش کرنے لگی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ کسی روز عالم کو بھی اس روپ میں دیکھے گی جس روپ میں اس نے ایک دن ثاقب کو دیکھا تھا۔ وہ دونوں سویرا کے لئے نہایت بااثر افراد کی حیثیت رکھتے تھے اور سویرا انہیں ناقابلِ تسخیر تصور کرتی تھی.......... مگر اس نے ان دونوں کو اپنے سے زبردست افراد کے سامنے اوندھے منہ گرتے دیکھا تھا۔ گڑگڑاتے ہوئے اور لرزتے ہوئے.......... ایک بار پھر اس کے ذہن میں بچپن میں سنا ہوا وہی مقولہ آگیا تھا۔ "ہر بڑی مچھلی چھوٹی مچھلی کو کھاتی ہے۔" یہ سلسلہ نیچے سے شروع ہو کر اوپر تک چلتا چلا جاتا ہے۔

تھوڑی ہی دیر بعد وہ گاڑی اسٹارٹ ہونے اور گیٹ وغیرہ کھلنے کی آواز سن رہی تھی۔ اس ابر آلود رات میں عالم چوہدری اپنی گاڑی میں لاہور کی طرف بھاگ رہا تھا۔

صبح سویرے ناشتے سے پہلے ہی عالم چوہدری کا خاص کارندہ فلک شیر سویرا کے پاس آیا اور اس نے کہا کہ حویلی میں مہمان آئے ہیں' وہ آپ سے ملنا چاہ رہے ہیں۔

سویرا نے انجان بن کر پوچھا کہ وہ کون ہیں؟

فلک شیر نے مہمان کا نام سہراب جلالی بتایا۔ سویرا کو یہ نام کچھ جانا پہچانا سا لگ رہا تھا۔ رات کو مہمان کی صورت میں بھی اسے تھوڑی سی شناسائی دکھائی دی تھی۔ سویرا نے فلک شیر سے پوچھا۔ "یہ شخص کون ہے؟"

فلک شیر بولا۔ "یہ بڑے مشہور بندے ہیں جی.......... شاید اخبار وغیرہ میں بھی آپ نے ان کا نام پڑھا ہوگا۔ یہ اس علاقے کے مشہور سیاست دان ہیں.......... وزیر مشیر بھی رہ چکے ہیں۔ آپ کو پتا ہے آج کل سیاسی کام ٹھنڈا پڑا ہے۔ کچھ سیاسی پارٹیوں پر پابندی لگی ہوئی ہے۔ ان کی پارٹی پر بھی پابندی ہے۔ مگر ان کا اثر رسوخ تو پہلے کی طرح ہی ہے سب کام اسی طرح ہو رہے ہیں جیسے پہلے ہوتے تھے۔ سہراب صاحب آج کل امریکا میں ہوتے ہیں۔ وہاں بھی ان کی کافی جائیداد ہے جی۔ یہ اپنے چوہدری صاحب کے بھی بڑے مہربان ہیں جی۔ جب سہراب جلالی پاکستان میں ہوتے تھے تو اکثر شکار وغیرہ کھیلنے ادھر آتے

رہتے تھے۔"

سویرا اس شخص سے ہرگز ملنا نہیں چاہتی تھی اور اس کا دل بھی چاہ رہا تھا کہ وہ ملنے سے انکار کر دے لیکن پھر اچانک جانے کیا بات دل میں آئی کہ وہ چادر وغیرہ اوڑھ کر فلک شیر کے ساتھ نشست گاہ میں چلی گئی۔

سویرا کو اندر داخل ہوتے دیکھا تو سہراب جلالی نے فوراً اٹھ کر تعظیم پیش کی۔ سہراب کی عمر تقریباً چالیس بیالیس سال رہی ہوگی یعنی وہ عالم چوہدری کا ہم عمر تھا یا اس سے کچھ بڑا ہوگا۔ تاہم وہ عالم سے بالکل مختلف شخص تھا۔ عالم کو دیکھ کر سویرا کو اکثر ایک خطرناک اور عیار جانور کا خیال آتا تھا۔ ایسا جانور جو چالباز ہونے کے علاوہ جسمانی طور پر بھی بہت مضبوط اور اکھڑ تھا لیکن سہراب عام قد اور چھریرے جسم کا مالک تھا۔ وہ کلین شیو تھا' اس کے پتلے پتلے ہونٹ اس کے مضبوط ارادے اور گہری لیکن دھیمی شخصیت کو ظاہر کرتے تھے۔ وہ بڑی نفیس شلوار قمیص پر واسکٹ پہنے ہوئے تھا۔ رات کو اس عام سے شخص نے ہٹے کٹے دبنگ عالم چوہدری کو تھپڑ اور ٹھڈے مارے تھے۔

اس شخص نے شائستہ لہجے میں سویرا سے اپنا مختصر تعارف کرایا پھر کہنے لگا۔ "اگر آپ برا نہ منائیں تو میں ایک نجی قسم کا سوال آپ سے کرنا چاہتا ہوں۔ میری معلومات کے مطابق آپ اس حویلی میں کافی عرصے سے مقیم ہیں۔ کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ آپ یہاں کس حیثیت سے ہیں؟"

سویرا نے ایک نظر سہراب جلالی کی طرف دیکھا پھر بولی۔ "اگر میں اس سوال کا جواب نہ دینا چاہوں تو؟"

"تو کوئی بات نہیں مس سویرا۔" وہ خوش دلی سے بولا۔

اس نے اپنی صوابدید پر ہی اسے مس بنا دیا تھا۔ کمرے میں کچھ دیر تک بوجھل خاموشی طاری رہی پھر جلالی بولا۔ "رات کو عالم بہت جلدی میں چلا گیا تھا۔ آپ سوئی ہوئی تھیں۔ شاید وہ آپ کو بتا کر بھی نہیں گیا۔ وہ جس ارجنٹ کام کے لئے گیا ہے وہ تھوڑا سا طویل بھی ہو سکتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہ آج رات کو یا کل صبح ہی آپائے گا۔ ممکن ہے کہ ابھی تھوڑی دیر میں اس کا فون وغیرہ آجائے۔"

"فون تو کل سے خراب ہے۔" سویرا نے کہا۔

"اوہ' مجھے بھی ایک دو ضروری کالیں کرنا تھیں۔ خیر کچھ کرلیتا ہوں۔" جلالی نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا۔ اس کے سوچنے کا انداز عجیب سا تھا۔ ارد گرد کی ہر شے کو وہ بھول سا جاتا تھا۔

کمرے میں پھر بوجھل خاموشی طاری ہوگئی' سویرا نے کہا۔ "کیا اب میں جاسکتی ہوں؟"

"اوہ ویری سوری!" وہ کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔ "میں نے آپ کو زحمت دی۔"

سویرا واپس اپنے کمرے میں آگئی۔

سہراب جلالی تنہا نہیں آیا تھا۔ اس کا سیکرٹری اور تین باڈی گارڈز بھی ہمراہ تھے۔ "گارڈ کم ڈرائیور" بھی ساتھ تھا۔ سہ پہر تک حویلی کا فون صحیح ہوگیا۔ چار بجے لاہور سے عالم کی کال آگئی۔ سویرا نے بات کی۔ عالم نے اسے بتایا۔ "سہراب صاحب خاص مہمان ہیں۔ خانو بابا سے کہہ کر بڑے خانساماں کو بلالو۔ ان کے طعام قیام کا خاص اہتمام کرنا ہوگا۔ تم بھی انہیں کمپنی دو۔ ہو سکے تو ڈنر ان کے ساتھ ہی کرنا۔ جلالی صاحب اپنے خاص مہمان ہیں۔"

"جی ہاں' اس کا کچھ اندازہ مجھے رات کو ہی ہوگیا تھا۔" سویرا نے کہا۔

"کک......... کیا مطلب؟"

"رات کو آپ ان کے استقبال کے لئے بڑی افراتفری میں کپڑے بدل رہے تھے نا۔" سویرا نے بات بنائی۔

"کچھ بہت ضروری کام ہیں۔ آج رات تو میں بالکل نہیں آسکتا' کل کسی وقت پہنچ جاؤں گا۔"

سویرا نے رات کا کھانا اہتمام سے پکوایا تھا۔ خانساماں کی مدد عابدہ نے کی تھی۔ سویرا کھانے میں تو سہراب جلالی کے ساتھ شریک نہیں ہوئی تھی تاہم بعد میں وہ نشست گاہ میں آبیٹھا تھا اور وہاں سویرا کچھ دیر اس سے باتیں کرتی رہی تھی۔ جلالی کی شخصیت میں عجیب سا سحر تھا۔ دھیمے لہجے میں بولنے والا! یہ شخص اپنی بے پناہ ذہانت اور مقناطیسی کشش

کے سبب اپنے مخاطب پر حاوی ہو جاتا تھا اور پھر حاوی ہوتا چلا جاتا تھا۔ وہ پڑھا لکھا شخص تھا۔ اس کی گفتگو میں بدرجہ اتم شائستگی تھی۔ اس کا وسیع کاروبار فیصل آباد اور سرگودھا وغیرہ میں پھیلا ہوا تھا۔ اس کے پائے کے شاید چند ایک صنعت کار ہی صوبے میں ہوں گے۔ اس نے بتایا کہ ملک کے سیاسی حالات مؤافق نہیں ہیں۔ ابھی سال ڈیڑھ سال مزید اسے بیرون ملک رہنا پڑے گا۔ وہ چند روز کے لئے پاکستان آیا ہے۔

ناشتے کے موقع پر پھر جلالی سے سویرا کی بات چیت ہوئی۔ دو تین ملاقاتوں میں ہی وہ سویرا سے یوں باتیں کرنے لگا تھا جیسے اسے مدتوں سے جانتا ہو۔ گفتگو کے دوران میں وہ بڑی دانائی سے سویرا کو مختلف مشورے بھی دیتا جاتا تھا۔ سویرا کو یوں لگتا تھا جیسے ان دو تین ملاقاتوں میں ہی جلالی کی معاملہ فہم نگاہوں نے اس کا ایکسرے لے لیا ہے اور وہ سویرا کے بتائے بغیر ہی اس کی زندگی کے سارے حالات جان گیا ہے۔ دوپہر کو لان کی دھوپ میں بیٹھ کر انگریزی اخبار پڑھتے پڑھتے جلالی نے اچانک سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا اور بولا "یہ کمینہ کبھی تم سے شادی نہیں کرے گا۔ اسی طرح رکھے گا تمہیں......... میں اس کی خصلت کو بڑی اچھی طرح جانتا ہوں۔"

سویرا کانپ گئی۔ "آ......... آپ کس کی بات کررہے ہیں؟"

وہ ذرا سا چونکا پھر سنبھل کر بولا۔ "اسی کی بات کررہا ہوں جس کی تم سمجھ رہی ہو۔ مجھ سے چھپانے کی کوشش مت کرو۔ میں سب سمجھ رہا ہوں۔"

سویرا ایک دم خاموش ہوگئی تھی۔ اسے توقع نہیں تھی کہ سہراب جلالی ایسے واشگاف انداز میں بات کرگزرے گا۔

جلالی کچھ دیر تک خالی خالی نظروں سے اسے دیکھتا رہا پھر بولا۔ "میں معافی چاہتا ہوں۔ ہماری معمولی سی شناسائی ہے۔ مجھے اس قسم کی بات نہیں کرنی چاہئے تھی۔ بہرحال یہ ضرور کہوں گا کہ اس شخص سے کوئی نیک توقع مت رکھنا۔ یہ ان لوگوں میں سے ہے جو محبت کی زبان نہیں سمجھتے۔"

"آپ کو شاید کوئی غلط فہمی ہو رہی ہے۔ میں یہاں اپنی مرضی اور......... خوشی سے

"کاش، واقعی ایسا ہوتا۔" اس نے کہا اور ایک بار پھر اخبار میں کھو گیا۔

عالم دوسرے روز بھی لاہور سے واپس نہیں آسکا تھا۔ تاہم اس نے اپنے ایک ماتحت کے ہاتھ حویلی سے کچھ کاغذات وغیرہ منگوائے تھے۔ دو تین بار اس کا فون بھی آیا تھا۔ اس نے سویرا کو ہر طرح جلالی صاحب کا خیال رکھنے کی تاکید کی تھی۔

زندگی میں پہلی بار سویرا کو اندازہ ہوا تھا کہ بارعب شخصیت کے لئے بھاری تن و توش اور گھن گرج کا ہونا ضروری نہیں۔ دھیمے لہجے میں بولنے والا ایک عام سا شخص بھی ایک نہایت متاثر کن اور مہیب شخصیت کا مالک ہو سکتا ہے۔ اس نے جلالی کی خاموش ذہانت اور دانائی کو بے پناہ شدت سے محسوس کیا تھا۔ اسے یوں لگا تھا جیسے یہ شخص ہپناٹائز کرنے کی قوت رکھتا ہے۔ وہ چاہے تو ہزاروں کے مجمع کو اپنی مختصر گفتگو سے اپنا ہمنوا بنا سکتا ہے اور جس چیز کی تمنا کرے وہ اسے مل سکتی ہے۔

تیسرے دن عالم لاہور سے واپس آگیا۔ واپسی کے بعد بند کمرے میں دیر تک اس نے سہراب جلالی سے بات چیت کی تھی۔ اس گفتگو کا نتیجہ تو سویرا کو معلوم نہیں تھا تاہم اسے اندازہ ہوا تھا کہ جلالی ابھی بھی عالم چوہدری سے ناخوش ہے۔ عالم کے آنے کے بعد دو دن مزید جلالی ان کے ہاں مہمان رہا۔ اس دوران میں وہ لوگ شکار پر بھی گئے۔ عالم نے سویرا کو بھی اپنے ساتھ رکھا تھا۔ پھر ایک رات عالم نے کچھ فوک سنگروں کو حویلی میں بلایا۔ ان کے ساتھ مقامی بھانڈ بھی تھے۔ غالباً عالم چوہدری.......... جلالی صاحب کے چہرے پر مسکراہٹ دیکھنا چاہتا تھا مگر مسکراہٹ وہاں کہیں نہیں تھی۔ ان تمام مصروفیات کے دوران میں عالم چوہدری واضح طور پر جلالی صاحب کے سامنے دبا اور سہما ہوا نظر آیا تھا۔

تیسرے روز سہراب جلالی حویلی سے چلا گیا تھا۔ تاہم ابھی وہ لاہور جا رہا تھا۔ اسے اپنے بھتیجے کے پلازے کا کام دوبارہ سے شروع کرانا تھا اور بھتیجے کے جو کارندے کارپوریشن کے افسروں کے ساتھ لڑائی کی وجہ سے اندر ہوئے تھے، ان کی رہائی کی کوشش کرنا تھی۔ امریکا واپسی دو ہفتے بعد ہونا تھی۔

تین چار دن بعد عابدہ نے اسے ایک تازہ اخبار میں سے ایک تصویر دکھائی۔ یہ جلالی صاحب کی ہی تصویر تھی۔ وہ ایک خیراتی ادارے کی عمارت کا سنگ بنیاد رکھ رہا تھا۔ اس

خبر میں یہ بھی مذکور تھا کہ جلالی لاہور کے ایک اسپتال میں اپنے خرچ پر دو وارڈز تعمیر کرائے گا۔ اس خبر میں جلالی صاحب کے بارے میں اور بھی کئی باتیں لکھی گئی تھیں۔

اپنی امریکا روانگی سے دو روز پہلے جلالی دوبارہ حویلی آیا۔ سویرا کو عالم ہی کی زبانی معلوم ہوا کہ یہاں سے کچھ فاصلے پر جلالی صاحب کی زمینیں بھی ہیں۔ وہ اس کے معاملات دیکھنے کے لئے ہی آیا ہے۔ دوپہر سے تھوڑی دیر پہلے جلالی صاحب نے عالم کو کسی کام سے ساہیوال بھیج دیا۔ اس وقت سویرا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی کہ عالم کو صرف اس لئے بھیجا گیا ہے کہ وہ سویرا سے کچھ بات کرنا چاہتا تھا۔

عالم کے جانے کے تھوڑی ہی دیر بعد جلالی صاحب نے عابدہ کے ذریعے سویرا کو نشست گاہ میں بلایا۔ کچھ دیر تک اِدھر اُدھر کی باتیں کرتا رہا پھر حسب عادت بالکل اچانک بولا۔ "تم مجھ سے شادی کرو گی؟"

سویرا بھونچکی رہ گئی۔ بس ششدر نگاہوں سے جلالی صاحب کی طرف دیکھتی رہی۔ وہ بڑے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ "میں تمہیں لکھ کر دے دیتا ہوں، یہ عالم تمہیں آزاد کرے گا اور نہ تم سے شادی کرے گا۔ جب تک زندہ رہو گی اسی طرح گناہ کی دلدل میں ڈوبی رہو گی۔ میں تمہیں اس دلدل سے نکالنا چاہتا ہوں.......... اور میں نکال سکتا ہوں۔"

سویرا کے ہونٹ تھرائے لیکن وہ کچھ بھی بول نہیں پائی۔ جلالی صاحب نے سلسلہ کلام جوڑتے ہوئے کہا۔ "اپنے کوائف تو میں نے تمہیں بتا ہی دیئے تھے۔ پندرہ سال پہلے میں اپنی بیوی کو طلاق دے چکا ہوں۔ اس کے بعد میں کسی عورت سے وابستہ نہیں رہا۔ اس بیوی سے میرے صرف دو بچے تھے۔ بچی شادی شدہ ہے، بچہ کینیڈا میں زیر تعلیم ہے۔ اس کے علاوہ بھی کئی باتیں تمہیں معلوم ہیں۔ جو نہیں معلوم، وہ پوچھ سکتی ہو۔"

سویرا خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر رہ گئی۔ اس کا حلق سوکھ کر کانٹا ہو گیا تھا۔ وہ ایک لفظ بھی بول نہیں سکتی تھی۔

جلالی صاحب نے کہا۔ "میں تم سے کوئی فوری جواب طلب نہیں کر رہا ہوں۔ تم بڑے آرام اور تسلی سے سوچو۔ ہر پہلو پر غور کرو۔ اس کے بعد بھی تم انکار کرنے کے

لئے مکمل آزاد ہو۔ صرف ایک بات کہوں گا۔ اس بارے میں سوچتے ہوئے عالم کے خوف کو اپنے قریب بھی نہ پھٹکنے دینا۔ وہ بہت برا سہی لیکن میرے سامنے اسے اکثر اپنی پتلون خراب ہونے کا اندیشہ رہتا ہے۔"

☆=========☆=========☆

ٹھیک تین مہینے بعد فروری میں عین ویلنٹائن ڈے کے موقع پر ایری زونا کے ایک ہوٹل میں سویرا کی شادی خاموشی کے ساتھ سابق منسٹر سہراب جلالی کے ساتھ ہو گئی تھی۔ اس شادی سے دو ہفتے پہلے جوت گڑھ میں عالم چوہدری نے لرزتے ہاتھوں سے وہ طلاق نامہ سویرا کے حوالے کیا تھا جو تقریباً دو سال سے اس کی الماری کی دراز میں پڑا ہوا تھا۔ اس طلاق نامے کے ساتھ سویرا کا امریکا کا ویزا اور دیگر سفری کاغذات بھی اس نے سویرا کے سپرد کئے تھے۔ اس کے علاوہ گردن جھکا کر یہ بھی کہا تھا کہ سویرا اس کا کہا سنا معاف کر دے۔

"کہا سنا معاف کرنے والا فقرہ" اس کے جرائم کے سامنے بہت معمولی تھا۔ اس کے بجائے تو وہ کچھ بھی نہ کہتا تو اچھا تھا۔ سویرا نے دل ہی دل میں اس کے منہ پر تھوکا تھا اور اپنا رخ پھیر لیا تھا۔

سہراب جلالی، خوبرو سویرا کو بیاہ کر میامی کے ایک خوبصورت ولا میں لایا تھا۔ یہ کوئی بڑی عمارت نہیں تھی لیکن بہت دلکش تھی۔

پہلے روز ہی جلالی نے اس سے کہا تھا۔ "سویرا! اپنا ماضی بھول جاؤ۔ میں تم سے کچھ نہیں پوچھوں گا۔ بس یہ یاد رکھو کہ آج سے تم میری بیوی ہو، اور ہمیں اکٹھے زندگی گزارنی ہے۔"

سویرا بس اثبات میں سر ہلا کر رہ گئی تھی........ سویرا کی اور جلالی کی عمر میں تقریباً بیس سال کا فرق تھا۔ جلالی کی سنجیدگی اور دانائی کے سبب یہ فرق اور بھی زیادہ معلوم ہوتا تھا، بہرحال جلالی ایک مرد کی حیثیت سے خاصا پُرجوش تھا۔ اس کی گرمجوشی اور توجہ نے سویرا کو احساس دلایا کہ وہ اب بھی جسمانی طور پر دلکش اور جوان ہے........ وہ سوچتی کاش اس کا دل بھی جوان ہوتا۔ جوان نہ ہوتا تو کم از کم زندہ ہی ہوتا لیکن وہ تو مر چکا تھا۔

جام نگر میں اپنے گھر کی چھت سے اترتے ہی وہ مر گیا تھا اور احسن سے آخری ملاقات کے بعد ہی اس کی موت واقع ہو گئی تھی۔ اس کے بعد تو بس اس کا جسم ہی جیتا رہا تھا۔ اس جسم سے کبھی ثاقب کھیلا تھا کبھی عالم چوہدری نے اپنی راتیں رنگین کی تھیں اور اب سہراب جلالی اس سے اپنی بالادستی کا خراج وصول کر رہا تھا.......... بہرحال کچھ بھی تھا، اب سویرا کے گرد گناہ کی دلدل تو نہیں تھی۔ وہ باقاعدہ جلالی صاحب کی منکوحہ تھی۔ اس نے اسے اپنا نام دیا تھا۔

سویرا نے جلالی سے بس ایک ہی درخواست کی تھی، وہ لاہور میں اپنے اہلِ خانہ کا تحفظ چاہتی تھی اور جلالی نے بڑے آہنی لہجے میں کہا تھا کہ کوئی سویرا کے اہلِ خانہ کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھ سکتا۔ اگرچہ سویرا کو یقین تھا کہ وہی ہو گا جو جلالی صاحب نے کہہ دیا ہے مگر پھر بھی اس کے دل سے وسوسے نہیں جاتے تھے۔

جلالی کی زبانی سویرا کو معلوم ہوا تھا کہ اس کا پہلا شوہر ثاقب خود پر قائم ہونے والے سنگین مقدمے سے گھبرا کر دوبئی فرار ہو گیا تھا اور اب اس کا کچھ پتا نہیں۔ سویرا کے گھر والے یہی خیال کرتے تھے کہ سویرا بھی ثاقب کے ساتھ ہی پاکستان سے چلی گئی ہے۔ یہ صورتِ حال سویرا کے لئے کسی حد تک اطمینان بخش تھی۔ وہ خود بھی یہی چاہتی تھی کہ دھیرے دھیرے اس کے اہلِ خانہ اس کے بارے میں سوچنا چھوڑ دیں۔ اسے اس کے حال پر چھوڑ دیں اور اپنی زندگیوں کو اس کے سائے سے بھی دور رکھیں۔ اب بس اس کی ایک ہی خواہش تھی۔ وہ اپنے ابو کا دیرینہ خواب پورا کرنا چاہتی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ زلفی کسی عام سرکاری اسکول کے بجائے کسی اچھے تعلیمی ادارے میں داخل ہو اور اعلیٰ تعلیم حاصل کرے۔

اس نے اپنی یہ خواہش جلالی سے بیان کی تو وہ مسکرایا۔ سویرا کے بالوں کی لٹ اس کے رخسار سے ہٹاتے ہوئے بولا۔ "بھئی! تمہارے ہونٹوں میں تو علی بابا والی طاقت ہے۔ تم "سم سم کھل جا" کہہ کر اس خاکسار سے کیا نہیں کرا سکتی ہو۔"

اور پھر ایک ہی ماہ بعد لاہور میں زلفی کا داخلہ ایک اچھے اسکول میں ہو گیا تھا اور اس کے لئے چار سال کے تعلیمی اخراجات بھی ایک بینک میں جمع ہو گئے تھے۔ اسے

میرٹ پر داخلہ ملا تھا۔ تاہم آج کے دور میں اکثر جگھوں پر میرٹ بھی سفارش اور اسٹیٹس کا محتاج ہوتا ہے۔ اس موقع پر سویرا اپنے گھر رابطہ کرنا چاہتی تھی۔ بہت سی مبارک بادیں جمع ہوگئی تھیں۔ زلفی کے داخلے کی مبارک باد' پنکی کے پہلے بچے کی مبارک باد۔ توقیر کی شادی کی مبارک باد' عدنان کے وظیفے کی مبارک باد' لیکن پھر وہ رابطہ کرتے کرتے رہ گئی تھی۔ اس نے اپنے دل پر ایک بھاری پتھر رکھ لیا تھا اور فیصلہ کیا تھا کہ وہ اپنی زندگی کے طوفانوں سے اپنے اہل خانہ کو آگاہ نہیں کرے گی۔

تقریباً ڈیڑھ سال تک سویرا کو سہراب جلالی کی بھرپور توجہ حاصل رہی تھی۔ اس دوران میں سویرا نے ایک بچے کو بھی جنم دیا تھا۔ یہ مردہ بچہ تھا۔ اس کے دل کی طرح مردہ۔ یہ بچہ جس جسم سے پیدا ہوا تھا اس میں روح نہیں تھی پھر بچے میں روح کہاں سے ہوتی۔ اس کے بعد کچھ عرصہ سویرا سخت بیمار رہی تھی۔ اس کے ذہن میں عجیب خیال آتے تھے۔ اس کا پھول سا بیٹا دنیا میں آیا تھا لیکن اس فضا میں سانس نہیں لے سکا تھا۔ اپنی ننھی آنکھیں کھول کر اپنی ماں کو دیکھ نہیں سکا تھا.......... ایک گھونٹ پانی ماں سے نہیں پی سکا تھا۔ وہ پہروں بیٹھی' اس روٹھ جانے والے معصوم کے بارے میں سوچتی رہتی تھی۔ پھر آہستہ آہستہ زخم پر کھرنڈ آنے لگا تھا اور وہ نارمل ہوگئی تھی۔

اپنی بیماری کے دوران میں ہی سویرا پر یہ غمناک انکشاف ہوا تھا کہ جلالی کی ایک اور بیوی بھی یہیں امریکا میں موجود ہے۔ وہ بھارتی حیدر آباد کی خاتون تھی اور اپنے تین بچوں کے ساتھ ریاست شکاگو میں رہتی تھی۔ بہت سے دیگر صدموں کی طرح سویرا نے یہ صدمہ بھی ہمت سے برداشت کیا اور رو دھو کر چپ ہوگئی تھی۔ غالباً اسے شادی کے پہلے دن سے ہی یقین تھا کہ کسی دن کسی موڑ پر کسی ذریعے سے اسے اس قسم کی اطلاع ضرور ملے گی۔

یوں لگتا تھا کہ سہراب جلالی کا دل اب سویرا سے بھرنا شروع ہوگیا ہے۔ اب وہ شاندار ولا سے ایک فلیٹ میں منتقل ہوگئی تھی۔ اس فلیٹ میں جلالی کی آمد کم و بیش دو ہفتے بعد ہوتی تھی۔ پھر آمد مزید کم ہوگئی اور وہ مہینے میں ایک آدھ بار آنے لگا۔ پھر یوں ہوا کہ مہینہ گزرنے پر بھی اس کی صورت دکھائی نہیں دیتی تھی۔ وہ بہانہ یہ بنا رہا تھا کہ ملک میں

سیاسی سرگرمیاں شروع ہوگئی ہیں اور اسے امریکا میں موجود پارٹی کے کارکنان کو متحرک کرنا پڑ رہا ہے۔ حقیقت کیا تھی یہ تو خدا ہی بہتر جانتا تھا یا پھر کوئی سیاست دان بتا سکتا تھا۔ سویرا بے چاری اس عیار نگری کے جنجالوں کی تہہ میں کہاں اتر سکتی تھی۔ اس کا گناہ بس اتنا تھا کہ وہ خوبصورت تھی۔ سفید پوش طبقے سے تھی اور بے آسرا تھی۔

ایک دن جلالی نادیر اسے سامنے بٹھا کر دیکھتا رہا تھا پھر بولا تھا۔ "تم سربازار رکھے ہوئے ایک پھول کی طرح ہو سویرا۔ تمہارے گرد مضبوط باڑ ہونی چاہئے تھی یا پھر تمہارے گرد تمہاری ہوشیاری اور چالاکی کے کانٹے ہی ہوتے۔ مگر کچھ بھی نہیں ہے۔ تمہاری خوش قسمتی ہے کہ تم انسانوں کے جنگل سے گزر کر زندہ سلامت یہاں تک پہنچ گئی ہو۔"

اپنی شادی کی دوسری سالگرہ کے صرف ایک مہینے بعد سویرا پر ایک اور روح فرسا انکشاف ہوا تھا۔ کئی دنوں سے جلالی کی صورت دکھائی دی تھی نہ اس کا فون آیا تھا۔ اپنے ایک ہمدرد ملازم کی زبانی سویرا کو پتا چلا تھا کہ جلالی نے ایک خوبصورت اطالوی ماڈل کے ساتھ دبئی میں شادی کرلی ہے اور اسے رہنے کے لیے وہیں گھر لے کر دیا ہے۔

شروع میں تو سویرا کو یقین نہیں آیا تھا مگر پھر بتدریج حالات نے گواہی دے دی تھی کہ ملازم عباسی کی اطلاع سو فیصد درست تھی۔ جلالی کو کام کے سلسلے میں باربار دبئی جانا پڑ رہا تھا۔ کوئی ڈیڑھ ماہ بعد جلالی سے ملاقات ہوئی تو سویرا نے اس بارے میں جلالی سے استفسار کیا۔ پہلے تو وہ انکار کرتا رہا۔ پھر جب سویرا نے ایک دو ثبوت پیش کئے تو جلالی واقعی جلال میں آگیا۔ اس نے اچانک مختلف لب و لہجہ اختیار کیا اور بے حد تپش کے عالم میں سویرا سے کہا کہ وہ اس کے معاملات میں زیادہ دخل نہ دے اور نہ ہی جاسوس بننے کی کوشش کرے۔ اس نے یہاں تک کہا کہ وہ کوئی کنواری دوشیزہ بیاہ کر نہیں آئی تھی پھر بھی اسے عزت دولت آرام سب کچھ ملا ہوا ہے۔ اس کے لواحقین سکون آرام کی زندگی بسر کر رہے ہیں اور ہر خوف سے آزاد ہیں۔ لہٰذا وہ حالات کو جوں کا توں رہنے دے۔

جلالی کی باتیں بڑی تلخ تھیں تاہم اس نے جو آخری بات کہی تھی وہی سویرا کے دل کا روگ تھی۔ وہ اپنے لئے ہر تکلیف اور آزمائش قبول کر سکتی تھی لیکن اپنے لواحقین

کے لئے کوئی خطرہ مول نہیں لے سکتی تھی۔ اسے تو لگتا تھا کہ وہ جی ہی ان کے لئے رہی ہے۔ وہ بڑی اچھی طرح جانتی تھی کہ اگر اسے جلالی کی پشت پناہی حاصل نہ رہی تو عالم چوہدری جیسا درندہ اسے اور اس کے لواحقین کو کبھی معاف نہیں کرے گا۔ عالم کا خوف اب بھی ایک بھوت بن کر سویرا کے ذہن پر سوار رہتا تھا اور یہ بے بنیاد خوف نہیں تھا۔ اسے اندازہ تھا کہ عالم کس قماش کا شخص ہے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ کسی بھی قیمت پر جلالی کو ناراض کرنا نہیں چاہتی تھی۔

☆==========☆==========☆

وقت اسی طرح گھسٹ گھسٹ کر گزرتا رہا۔ اپنے چار بیڈ روم والے فلیٹ میں سویرا ایک پاکستانی ملازمہ اور ایک بنگلہ دیشی ملازم کے ساتھ تنہائی اور بے چارگی کی زندگی بسر کرتی رہی۔ اسے زندگی کی بیشتر سہولتیں حاصل تھیں۔ تاہم یہ ایک حنوط شدہ' بے روح زندگی تھی۔ تنہائی میں یادیں ویسے بھی بڑی شدت سے حملہ آور ہوتی ہیں۔ سویرا بھی اکثر ماضی کی یلغار کی زد میں رہتی تھی۔

ایک دو بار ایسا بھی ہوا کہ یادِ ماضی جب عذاب بنی' اپنا دیس' اپنا شہر اور اپنا جام نگر جب بڑی شدت سے یاد آیا تو وہ پاکستان فون کئے بغیر نہ رہ سکی۔ اس نے ہزاروں میل دور ٹیڑھی میڑھی بستی جام نگر کے اس گھر میں فون کیا جہاں اس کی روح اور زندگی مقید تھی۔ اس نے بہن بھائیوں سے بات چیت کی۔ مگر اس نے یہ کام اپنی ملازمہ شکیلہ کے ذریعے کیا۔ شکیلہ......... سویرا کی ایک دیرینہ سہیلی کی حیثیت سے اس کے گھر فون کرتی تھی اور وہی باتیں کرتی تھی جو سویرا نے اسے پہلے لکھ کر دی ہوتی تھیں۔ سویرا ٹیلی فون سیٹ کو "ہینڈ فری" پر سیٹ کر دیتی تھی اور یوں اسپیکر فون کے ذریعے وہ ساری گفتگو سنتی تھی جو شکیلہ اس کے گھر والوں سے کرتی تھی۔ اس گفتگو سے جہاں سویرا کو اور بہت سی باتیں معلوم ہوئی تھیں' وہیں یہ خبر بھی ملی تھی کہ احسن نے والدین کے بے حد مجبور کرنے کے باوجود ابھی تک شادی نہیں کی......... چند سال پہلے واقعی اس کا ایک لاکھ کا انعامی بانڈ نکل آیا تھا۔ انعامی رقم سے اس نے سرامکس کا کام شروع کیا تھا اور اب اس کا کاروبار پھل پھول رہا تھا۔

احسن کی یاد کسی وقت سویرا کو اتنی شدت سے آتی کہ اسے دل کی نازک رگیں ٹوٹتی محسوس ہوتیں۔ احسن سے اپنی آخری ملاقات اسے یاد آتی اور اس کے ساتھ ہی آخری الفاظ بھی یاد آجاتے' اس نے کہا تھا۔ "بات معافی کی نہیں ہے سویرا۔ بات تو یہ سوچنے کی ہے کہ کیا ہم ایک دوسرے کے بغیر جی سکیں گے اور اگر جئیں گے تو وہ کیسی زندگی ہوگی؟"

وہ احسن کے ان آخری الفاظ کو بھولنا چاہتی تھی۔ احسن کو بھولنا چاہتی تھی لیکن اس کی کوششوں کا نتیجہ برعکس نکلتا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ وہ کسی کی بیوی ہے' اس کے قدموں کو تو کجا اس کی سوچ کو بھی بھٹکنا نہیں چاہئے مگر کسی وقت کچھ بھی اس کے بس میں نہیں رہتا تھا۔

مہینے ڈیڑھ مہینے بعد جب سہراب جلالی سے سویرا کی ملاقات ہوتی تھی تو وہ اکثر جلالی سے ایک گزارش کرتی تھی۔ وہ اس خوف کا ذکر کرتی تھی جو ڈپٹی ڈائریکٹر عالم چوہدری کے حوالے سے اس کے دل میں بیٹھ چکا تھا' وہ چاہتی تھی کہ کسی طرح جلالی سویرا کے اہل خانہ کو کسی دوسرے شہر میں سیٹل کرا دے' بلکہ اگر وہ چاہتا تو انہیں مڈل ایسٹ کے کسی ملک میں بھی سیٹل کرا سکتا تھا' جلالی کے تعلقات بہت وسیع تھے اور امارات میں اس کا سگا بھائی کاروبار کر رہا تھا۔ دراصل سویرا چاہتی تھی کہ اس کے اہل خانہ اور عالم چوہدری کے درمیان فاصلہ زیادہ سے زیادہ ہو جائے۔

جلالی نے متعدد بار سویرا سے وعدہ کیا کہ وہ اس کی یہ خواہش پوری کر دے گا مگر وعدہ......... بس وعدہ ہی رہا تھا۔ دھیرے دھیرے سویرا کو محسوس ہونے لگا تھا کہ جلالی شاید ایسا کرنا ہی نہیں چاہتا۔ وہ جہاندیدہ شخص یہ بات اچھی طرح سمجھتا تھا کہ سویرا کے وسوسے جب تک برقرار رہیں گے' وہ اس کی بے دام کی غلام بنی رہے گی اور وہ اسے غلام رکھنا چاہتا تھا۔ اس نے سویرا کو گارنٹی دے رکھی تھی کہ عالم چوہدری سویرا کی طرف یا اس کے اہل خانہ کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھ سکتا۔ وہ کبھی کبھی سویرا کے سامنے اس گارنٹی کو "ہائی لائٹ" بھی کرتا رہتا تھا۔ سویرا اس انداز سے سوچتی تھی تو کسی وقت اسے محسوس ہونے لگتا تھا کہ شاید جلالی بھی اسے بلیک میل ہی کر رہا ہے۔ عالم چوہدری

اور ثاقب کالئے کی بلیک میلنگ واشگاف تھی جبکہ اس نیک نام سیاست داں کی بلیک میلنگ پر شائستگی کا خول چڑھا ہوا تھا۔

اب شامیں سویرا کو بہت اداس کرتی تھیں' کیونکہ وہ اسے جام نگر کی شاموں کی یاد دلاتی تھیں۔ ان صاف ستھری کثیرالمنزلہ سڑکوں اور بلند و بالا جدید عمارتوں کے درمیان بھی سویرا کو وہ بے ترتیب اور گنجلک بستی یاد آتی تھی جہاں گلیوں میں کرکٹ ہوتی تھی' آسمان پر پتنگیں ڈولتی تھیں اور چمنیوں سے دھواں نکلتا تھا۔ ایک ایسی ہی شام تھی' وہ دسویں منزل پر واقع اپنے فلیٹ کی کھڑکی میں خاموش بیٹھی تھی۔ ادھیڑ عمر بنگلہ دیشی ملازم ساتھ والے کمرے میں کپڑوں پر استری وغیرہ کر رہا تھا۔ دفعتاً کال بیل بجی۔ ملازمہ شکیلہ نے جاکر دیکھا اور سویرا کو بتایا۔ "کوئی پاکستانی ہے۔ اپنا نام نہیں بتا رہا۔ آپ سے ملنا چاہتا ہے۔"

سویرا دروازے پر پہنچی۔ سیفٹی چین کے سبب دروازہ بس پانچ چھ انچ تک ہی کھل سکتا تھا۔ سویرا نے درز میں سے دیکھا اور منجمد رہ گئی۔ سامنے احسن کھڑا تھا۔ آج وہ تقریباً چار سال بعد احسن کو دیکھ رہی تھی۔ اس کا وزن معمولی سا بڑھا تھا۔ اس کے علاوہ کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی تھی۔ سویرا کے سان و گمان میں بھی نہیں تھا کہ پاکستان سے ہزاروں میل دور میامی کے اس فلیٹ کے مین دروازے پر احسن سے اس کی ملاقات ہوگی۔ دونوں کی آنکھوں میں نمی سی تیر گئی تھی۔ کتنی ہی دیر تک دونوں کچھ بول نہ سکے۔ پھر رسمی کلمات کا تبادلہ ہوا اور معمولی سے تذبذب کے بعد سویرا احسن کو ڈرائنگ روم میں لے آئی۔

"احسن......... تم......... یہاں کیسے پہنچے؟ میرا تو دماغ چکرا گیا ہے۔"

"یہ ایک لمبی کہانی ہے' اس میں اہم بات یہی ہے کہ میں پہنچ گیا۔ کہتے ہیں انسان کوشش کرے تو خدا کو بھی ڈھونڈ لیتا ہے۔"

"تت......... تمہیں یہاں نہیں آنا چاہئے تھا۔" وہ کسی ٹین ایجر کی طرح بولی۔

"چلو اب تو آگیا ہوں' اب کیا ہو سکتا ہے۔"

"تم......... کچھ نہیں جانتے ہو' میں نے........."

"میں کافی کچھ جانتا ہوں۔" احسن نے اس کی بات کاٹی۔ "اور اسی لئے شاید میں یہاں موجود بھی ہوں۔ سویرا' تم تک پہنچنے کے لئے میں نے بڑے پاپڑ بیلے ہیں۔ ان تمام واقعات کو جمع کیا جائے تو ایک ڈراما سیریل بن سکتی ہے جس کا عنوان "کھوج" رکھا جاسکتا ہے۔"

احسن گو ہلکے پھلکے انداز میں بات کر رہا تھا مگر سویرا دیکھ رہی تھی کہ اس کی آنکھوں میں گہرا کرب بھرا ہوا ہے۔

دونوں میں کچھ دیر گفتگو ہوتی رہی۔ بنگلہ دیشی ملازم دو تین بار دروازے کے سامنے سے گزر چکا تھا۔ سویرا کو اکثر شبہ ہوا کرتا تھا کہ یہ شخص ملازم کے علاوہ سویرا کا نگراں بھی ہے۔

احسن نے چائے ختم کی تو سویرا نے کہا۔ "احسن! ہماری باتیں تو اتنی زیادہ ہیں کہ سالوں سال بیٹھ کر کرتے رہیں تو بھی ختم نہ ہوں۔ میں ان ساری باتوں کو بس ایک بات سے ختم کرنا چاہتی ہوں۔"

"ہاں کہو۔"

"مجھے میرے حال پر چھوڑ دو احسن! بھول جاؤ کہ کبھی کوئی سویرا تم لوگوں کے درمیان موجود تھی۔ کچھ گزر گئی ہے باقی بھی گزر جائے گی۔ پلیز احسن! یہاں سے چلے جاؤ اور پھر کبھی اس رخ پر نہ آنا۔"

احسن نے ایک گہری سانس لی اور عجیب ڈرامائی لہجے میں بولا۔ "میں چلا جاتا ہوں لیکن میں اکیلا نہیں جاؤں گا۔ میں تمہیں ساتھ لے جانے کے لئے آیا ہوں سویرا۔ تمہارا کچھ بھی مجھ سے چھپا ہوا نہیں ہے' میں جانتا ہوں کہ تمہاری پہلی شادی کی طرح یہ دوسری شادی بھی کس قدر کامیاب ہے۔ تمہاری اس [illegible] ازدواجی زندگی کی ساری حقیقتیں میں جانتا ہوں۔ میں نے تم سے کہا تھا نا [illegible] ...... میں کبھی تمہیں خدا حافظ نہیں کہوں گا۔"

"لیکن ساتھ میں یہ بھی تو کہا تھا کہ بھی [illegible] آواز بھی نہیں دوں گا۔" سویرا نے یاد دلایا۔

"تمہارے تمام حالات جاننے کے بعد بھی' میں اپنے اس وعدے پر قائم رہتا تو قیامت تک خود کو معاف نہ کر سکتا۔"

"نہیں احسن' اب یہ ممکن نہیں ہے۔" اس نے مایوسی سے سر ہلایا اور آنسو ٹپ ٹپ اس کی آنکھوں سے گرنے لگے۔

"میں ناممکن کو ممکن بنا دوں گا سویرا......... میں نے سب انتظام کر لیا ہے۔ میں جانتا ہوں تم جس شخص کی قید میں ہو' وہ بڑا با رسوخ ہے' اس کے ہاتھ بڑے لمبے ہیں۔ مگر ہم اس جنجال سے یوں نکلیں گے کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو گی۔ میں نے سب سوچ سمجھ لیا ہے۔ میں یہ سب کچھ تمہیں اتنی جلدی بتانا نہیں چاہتا تھا مگر اب تم گفتگو کو اس موڑ پر لے آئی ہو تو مجھے بتانا پڑ رہا ہے۔"

احسن' سویرا کو اپنی پلاننگ سے آگاہ کرنے لگا۔ اس نے واقعی بڑی تفصیل سے منصوبہ بنایا تھا' تمام جزئیات کا خیال رکھا تھا۔ اس پلاننگ میں اس کا ایک مقامی دوست بھی اس کے ساتھ شامل تھا۔ اس گرین کارڈ ہولڈر پاکستانی نے سویرا اور احسن کو بڑی حفاظت سے کینیڈا لے جانے کی ساری ذمے داری اپنے سر لی تھی۔ اس نے ایسا انتظام بھی کیا تھا کہ وہ سال ڈیڑھ سال تک بڑی خاموشی سے وہاں رہ سکتے تھے اور آئندہ کی پلاننگ کر سکتے تھے۔

سویرا خاموشی سے احسن کی باتیں سنتی رہی۔ اس کی آنکھوں میں آرزوؤں کی ٹوٹی ہوئی کرچیاں دیکھتی رہی۔ پیاس کے اس صحرا کو دیکھتی رہی جو لڑکپن سے لے کر اب تک پھیلتا رہا تھا اور اب بیکراں ہو چکا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ احسن کی آنکھوں میں اسے عزم نو نظر آتا رہا اور خوابوں کا وہ شیش محل نظر آتا رہا جو اس نے اور اس کے دوست نے ننھے ننھے لاکھوں آبگینے جوڑ کر سویرا کے لئے بنایا تھا......... اس گفتگو کے دوران میں چند کمزور لمحے ایسے بھی آئے جب سویرا کا دل چاہا کہ وہ ہر طرف سے آنکھیں اور کان بند کر کے اس کشتی میں پاؤں رکھ دے جو احسن ہزاروں میل دور سے دشوار پانیوں میں چلا کر اس کے لئے لایا ہے......... اور دنیا کے آخری کنارے تک اس کے ساتھ چلنے کی ہامی بھر لے لیکن جن لمحوں میں یہ خیال سویرا کے ذہن میں آیا' انہی لمحوں میں ایک ٹی وی

اسکرین بھی اس کی نگاہوں میں چمکی۔ اس نے دو بچے دیکھے جو اسکول بیگ کندھوں پر لٹکائے خراماں خراماں چلے جا رہے تھے......... چڑیا گھر میں دیکھے ہوئے رائل بنگال ٹائیگر کی آنکھوں کی چمک اس کے پردۂ تصور پر ابھری اور وہ جیسے سوتے سوتے ایک دم جاگ گئی۔

اس شام اس فلیٹ کے اس نیم گرم کمرے میں بیٹھ کر احسن نے اپنا سارا زور بیان صرف کر دیا تھا۔ اس نے سویرا کے سامنے بے شمار ٹھوس دلیلوں کے انبار لگا دیئے تھے' وہ رویا تھا۔ مچلا تھا' اس نے ضد کی تھی' اس نے منت کی تھی لیکن یہ سب کچھ سویرا پر بے اثر ہو رہا تھا۔ وہ خود بھی روتی رہی تھی اور احسن کو سمجھانے کی' اسے سنبھالنے کی کوشش کرتی رہی تھی۔

اس نے کہا تھا۔ "احسن' میں تمہارے جذبے کی صداقت کو مانتی ہوں......... اس جذبے کی شدت کو جتنا میں سمجھ سکتی ہوں' کوئی اور نہیں سمجھ سکتا۔ میں یہ بھی جانتی ہوں کہ تم اب بالکل لاچار و ناتواں نہیں رہے ہو۔ تم کاروبار کر رہے ہو۔ تم نے میرے لئے امریکا تک آ جانا بھی افورڈ کیا ہے۔ مگر احسن......... ہم جن لوگوں کے شکنجے میں ہیں وہ ہمیں اب بھی کیڑے مکوڑوں سے زیادہ اہمیت نہیں دیتے۔ یہ بہت بڑی بڑی مچھلیاں ہیں احسن......... اگر بات صرف میری ذات کی ہوتی احسن' تو میں شاید کچھ کر گزرتی لیکن میرے ساتھ میرے بہن بھائیوں کی زندگیاں یوں نتھی ہو گئی ہیں کہ میں انہیں جدا نہیں کر سکتی۔ جو قربانی میری شادی سے شروع ہوئی تھی' وہ ختم نہیں ہوئی ہے اور اگر کبھی ختم ہو بھی گئی تو پھر آگے چھوٹی بڑی قربانیوں کے اور سلسلے ہوں گے۔ پلیز احسن' تم قربان گاہ پر لیٹی ہوئی اس عورت سے خود کو جدا کر لو۔ اس بچی کھچی عورت میں اب کچھ نہیں رکھا احسن......... پلیز احسن' پلیز! میں تم سے زندگی میں اور کچھ نہیں مانگوں گی۔" وہ بلک بلک کر رونے لگی تھی۔

کمرے کی فضا' بوجھل سے بوجھل تر ہوتی جا رہی تھی۔

احسن نے گلوگیر آواز میں کہا۔ "سویرا' میں تمہارے سارے خوف سمجھتا ہوں۔ میں جانتا ہوں تمہیں بری طرح بلیک میل کیا جاتا رہا ہے اور تم ہوتی رہی ہو۔ میں تم سے

وعدہ کرتا ہوں‘ سویرا! میں تمہارے ہر خوف دور کر دوں گا۔ ہم قانون کی مدد لیں گے۔ مجھے بس تھوڑی سی مہلت دو۔ میں نے تمہارے لئے.........“

”پلیز احسن! یہ میرے جڑے ہوئے ہاتھ دیکھو‘ میں تمہاری منت کرتی ہوں‘ کہو تو تمہارے پاؤں پکڑ لیتی ہوں۔ مجھے معاف کردو یہاں سے چلے جاؤ تم۔“

وہ کچھ سننے کو تیار نہیں تھی‘ وہ بہت کچھ کہہ کر بھی بہت کچھ کہنا چاہتا تھا۔ وہ ہار کر بولا۔ ”ابھی تم بہت ڈپریس ہو سویرا! میں چند دن بعد پھر آؤں گا۔ ہم ان معاملوں پر ٹھنڈے دل سے غور کریں گے۔“

”نہیں احسن!“ سویرا نے بلا توقف کہا۔ ”مجھے خدشوں کی سولی پر مت لٹکاؤ۔ نہ ہی خود سراب کے پیچھے بھاگو‘ تم......... دس بار بھی آؤ گے تو میرا جواب یہی ہوگا۔ پلیز‘ اس معاملے کو آج یہیں ہمیشہ کے لئے ختم کردو۔“

وہ کتنی ہی دیر تک آنسوؤں کے پانی میں ڈولتے رہے تھے۔ ایک دوسرے کو اپنی بات سمجھانے کی کوشش کرتے رہے تھے۔ آخر احسن نے اس شخص کی طرح اپنا سر جھکا لیا تھا جو ایک ہی داؤ میں اپنا سب کچھ ہار کر اٹھ بیٹھا ہو۔

اور پھر وقتِ رخصت آگیا تھا۔ اشک بار آنکھوں والا‘ ٹوٹا اور روٹھا ہوا احسن نہ جانے کیوں سویرا کو پھر ایک بچے کی طرح لگا۔ کاش اس کے بس میں ہوتا‘ وہ اس بچے کو منا لیتی‘ اسے بانہوں میں لے لیتی یا خود اس کی بانہوں میں چلی جاتی۔ اپنا سر اس کی آغوش میں رکھ دیتی یا اس کا سر اپنی آغوش میں رکھ لیتی۔ وہ تو صدیوں کا سفر کرکے یہاں تک پہنچا تھا۔ وہ اسے ایک مسکراہٹ تک نہیں دے سکی تھی۔

وہ جانے کے لئے مڑا۔ اس نے ایک آہ کھینچی۔ اس آہ نے سویرا کا کلیجہ چیر کر رکھ دیا۔ وہ خود کو سنبھالتے ہوئے بولی۔ ”خدا حافظ احسن!“

”میں تمہیں سلامتی کی دعا دیتا ہوں لیکن خدا حافظ نہیں کہوں گا‘ کبھی نہیں کہوں گا۔“

وہ لمبے ڈگ بھرتا ہوا دروازے کی طرف گیا تھا۔ ”رکو احسن!“ سویرا نے کہا تھا۔

وہ رک گیا۔ سویرا اس کے پاس پہنچی۔ ”احسن‘ بس ایک آخری بات......... ایک

بار پھر تاکید کرتی ہوں جو کچھ تمہیں میرے بارے میں معلوم ہوا ہے‘ خدا کے واسطے اپنے تک ہی رکھنا۔ امی کو‘ میرے بہن بھائیوں کو اس بارے میں کچھ معلوم نہ ہو۔ میں ان سے اور ان کے خیالوں سے بہت دور رہنا چاہتی ہوں‘ میری بات سمجھ رہے ہو ناں تم؟“

سویرا محسوس کررہی تھی کہ اس کی آنکھوں سے التجائیں‘ آنسوؤں میں گھل کر ٹپک رہی ہیں۔ احسن نے اپنا سر اثبات میں ہلا دیا تھا۔

☆=========☆=========☆

وقت گزرتا رہا۔ دن اور رات کے پنچھی اپنے کالے اور سفید پروں سے اڑتے رہے اور ایک دوسرے کے پیچھے لپکتے رہے۔ تہوار آتے رہے اور جاتے رہے۔ موسم بدلتے رہے‘ اسی طرح پندرہ برس مزید گزر گئے۔ سویرا کے بالوں میں اب چاندی چمکنے لگی تھی۔ پندرہ برس گزر جانے کے باوجود بھی وہ اپنے اسی فلیٹ میں دو ملازمین کے ساتھ رہتی تھی۔ پاکستانی عورت اور بنگلہ دیشی مرد۔

اس فلیٹ سے باہر ان پندرہ برسوں میں بہت کچھ بدل چکا تھا۔ پانچ چھ سال تک سیاست میں بھرپور حصہ لینے کے لئے بعد سراب جلالی اس میدان سے ریٹائر ہو چکا تھا۔ اب وہ مستقل طور پر امریکا آکر آباد ہوگیا تھا۔ اس کے بینک اکاؤنٹس میں اتنے ڈالر جمع ہوچکے تھے کہ وہ باقی زندگی عیش آرام سے گزار سکتا تھا۔ سویرا کے ساتھ جلالی کا تعلق بس واجبی سا ہی رہ گیا تھا۔ اس کی پہلی بیوی جو حیدر آبادی تھی‘ ایک نہایت تیز طرار اور ہوشیار عورت تھی۔ وہ جلالی کو اپنے سائے سے نکلنے ہی نہیں دیتی تھی۔ ویسے بھی جلالی کو ذیابیطس ہو چکی تھی۔ زندگی کے مزے اس کے لئے بتدریج کم ہوتے جارہے تھے۔ وہ اپنا زیادہ وقت اب گولف کھیلنے اور آرام کرسی پر اینڈنے میں گزارتا تھا۔ مہینے دو مہینے بعد وہ رسمی انداز میں فلیٹ کا چکر لگاتا تھا۔ دو تین گھنٹے گزار کر چلا جاتا تھا۔ اس دوران میں بھی وہ اکثر اپنی بیماریوں کی باتیں ہی کرتا رہتا تھا۔

سویرا کبھی کبھی اس سے پوچھتی تھی۔ ”کبھی آپ کو مجھ پر اور میرے اکیلے پن پر ترس نہیں آتا۔“

وہ کہتا تھا۔ ”اس دنیا میں سب اکیلے ہیں سویرا بیگم! یہ انسانوں کا جنگل ہے۔“

"مگر میں تو شاید انسان بھی نہیں ہوں' ورنہ آپ مجھے ماں بننے کا حق تو دیتے۔"

اس بات پر وہ اکثر لاجواب ہو جاتا تھا۔ اس کی عمر رسیدہ آنکھوں میں ایک ندامت سی چمکتی تھی اور وہ فوراً کوئی نیا موضوع چھیڑ کر اس ندامت سے پہلو بچانے کی کوشش میں لگ جاتا تھا۔

یہ بات اب سویرا کے لئے کوئی راز نہیں رہی تھی کہ سویرا کے بطن سے پیدا ہونے والا بچہ اس لئے دنیا میں سانس نہیں لے سکا تھا کیونکہ اس کا باپ ایسا نہیں چاہتا تھا۔ اپنے باپ کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے وہ معصوم دودھ کی ایک بوند یا پانی کا ایک گھونٹ پئے بغیر اس دنیا سے گزر گیا تھا......... زچگی سے تین ماہ پہلے ہی سویرا کو کچھ ایسی دوائیں کھلانا شروع کردی گئی تھیں جن کے نتیجے میں سویرا کے بطن سے لاش تولد ہوئی تھی۔ اب سویرا کے لئے یہ بات بھی راز نہیں رہی تھی کہ جلالی کی پہلی بیوی نے دوسری اور تیسری شادی کی اجازت جلالی کو صرف اسی شرط پر دی تھی کہ ان بیویوں سے اس کی کوئی اولاد پیدا نہیں ہوگی۔ بے شمار دوسرے صدموں کی طرح سویرا نے یہ صدمہ بھی بڑے حوصلے سے جھیلا تھا۔ اس کے ابو کہا کرتے تھے۔ "عورت کے کئی روپ ہوتے ہیں اور ہر روپ پیارا ہوتا ہے۔ بیٹی' بہن' بیوی' ماں......... بیٹی تمہارا سب سے پہلا روپ ہے۔ یہ روپ تو میں دیکھ رہا ہوں۔ معلوم نہیں باقی روپ دیکھ سکوں گا یا نہیں۔" اس کے ابو کو کیا معلوم تھا کہ سویرا کا پہلا روپ ہی آخری ہے۔ باقی سب روپ اس روپ میں فنا ہو جائیں گے۔ وہ ساری زندگی بیٹی ہی رہے گی۔ بیٹی بن کر سوچے گی اور بیٹی بن کر ہی جئے گی۔ اس کے پیارے ابو جو ذمے داریاں اس کے کندھے پر ڈال جائیں گے' انہیں نبھاتے نبھاتے ہی وہ اس راہِ ہستی سے گزر جائے گی۔ کبھی کبھی وہ عجیب انداز سے سوچنے لگتی۔ چھوٹی مچھلی اور بڑی مچھلی کی تمثیل اس کی ذہن میں آتی......... وہ ایک چھوٹی سی کمزور مچھلی تھی۔ اسے ثاقب بشیر نے کھایا تھا۔ پھر ایک روز اس نے ثاقب بشیر کے طاقتور جسم کو ڈپٹی ڈائریکٹر عالم چوہدری کے جبڑوں میں تڑپتے پھڑکتے دیکھا تھا۔ پھر ایک دن ایسا بھی آیا تھا جب اس نے عالمگیر چوہدری کو اپنے سے بڑی مچھلی کی گرفت میں دیکھا تھا۔ اس مچھلی کا نام سہراب جلالی تھا۔ سویرا سوچتی تھی شاید ابھی یہ سلسلہ ختم نہ ہوا ہو۔ ایک دن اس نے اپنے خیالات

جلالی کے سامنے بیان کئے تھے' وہ مسکرایا تھا۔ "سویرا بیگم! مچھلیاں اس لئے شکار ہوتی ہیں کیونکہ وہ دوسری مچھلیوں کے درمیان ہوتی ہیں۔ ہم نے تو سمندر کو سلامتی کے ساتھ خیرباد کہہ دیا ہے۔ اپنی ایک چھوٹی سی علیحدہ جھیل بسالی ہے۔ بس اپنے لئے اور دوسروں کے لئے خیر مانگتے ہیں۔"

ان پندرہ سالوں میں ایک اور اہم واقعہ یہ ہوا تھا کہ اس کی امی بھی اس داغِ مفارقت دے گئی تھیں۔ وہ ان کی خدمت کر سکی تھی نہ ان کا چہرہ دیکھ سکی تھی۔ ان کی وفات کی اطلاع بھی اسے دو ماہ بعد ملی تھی۔ امی کو دنیا سے رخصت ہوئے اب چار سال ہونے کو آئے تھے۔ ان آخری چار سالوں میں سویرا کو اپنے بہن بھائیوں کی بہت کم خبر ملی تھی۔ بس ایک مرتبہ جلالی نے اتنا بتایا تھا کہ وہ لوگ لاہور میں ہی ہیں۔ تاہم جام نگر سے ایک نسبتاً اچھی آبادی میں شفٹ ہوگئے ہیں۔ مکان بھی پہلے سے کچھ بڑا ہے۔ جلالی ہی کی زبانی اسے یہ بھی پتا چلا تھا کہ عدنان کی بھی شادی ہوگئی ہے۔ توقیر کی بیوی اس کے لئے اپنی چھوٹی بہن لے کر آئی تھی۔ عدنان کے بعد دانش کی منگنی بھی ہو چکی تھی اور وہ بینک میں ملازمت کر رہا تھا۔ زلفی پڑھائی میں مصروف تھا۔

ان برسوں میں ہونے والے واقعات میں ایک اور اہم واقعہ بھی تھا۔ دو سال پہلے غنڈا صفت افسر "عالم چوہدری" کے دیرینہ خوف سے سویرا کی جان چھوٹ گئی تھی۔ عالم چوہدری کی لاش گنے کے کھیتوں سے ملی تھی۔ کسی نے ٹوکے کے پے در پے وار کرکے اس کا سر پاش پاش کردیا تھا اور شہ رگ کاٹ ڈالی تھی......... نامعلوم قاتل پکڑا نہیں گیا تھا۔ یوں تو عالم چوہدری کی کئی دشمنیاں تھیں تاہم اکثر لوگوں کا خیال تھا کہ عالم کا قتل "عابدہ" کی وجہ سے ہوا ہے۔ وہی عابدہ جو برسوں سے حویلی میں یرغمالی تھی۔ پہلے اس کی جوانی سے خراج وصول کیا جاتا رہا تھا۔ پھر اس سے مشقت کرا کے اس کی ہڈیوں کو رولا گیا تھا۔ وہ دن رات عالم چوہدری کے کارندوں کی روٹیاں پکاتی رہی تھی۔ آخر حویلی کی چاردیواری میں ہی دم توڑ گئی تھی۔ کہا جاتا تھا کہ عالم کا قتل عابدہ کے شوہر نے کیا ہے' جو برسوں پہلے منظر سے غائب ہوگیا تھا۔ ان پندرہ برسوں میں سویرا کو بارہا احسن کی یاد بھی آئی تھی۔ وہ اس یاد کو اپنے ذہن سے دور رکھنا چاہتی تھی۔ مگر یہ یاد' تند ریلے کی طرح

ذہن کے کواڑوں کو توڑتی ہوئی' رکاوٹوں کو روندتی ہوئی گھس آتی تھی اور درونِ خانہ وہ اودھم مچاتی تھی کہ ہستی تہہ و بالا ہو کر رہ جاتی تھی۔ وہ "میامی" کی بلند و بالا عمارتوں کے اوپر آسمانوں کو دیکھتی اور سوچتی کہ وہ بھی اسی آسمان کے تلے ہے' وہ کہاں ہے؟ کیا کررہا ہے؟ کس حال میں ہے؟ کبھی کبھی اسے لگتا جیسے وہ آج بھی باغِ جناح کے اس ویران گوشے میں کھڑا ہے جہاں وہ اس سے دامن چھڑا کر چلی آئی تھی۔ پتھر کی اس خالی خالی بینچ کو گھور رہا ہے جہاں وہ دونوں بیٹھتے تھے۔ وہ ورد کرنے والے انداز میں زیرِ لب پکارنے لگتی۔ "مجھے معاف کردو احسن۔ مجھے معاف کردو احسن.........!" آنسو بڑی روانی سے اس کے رخساروں پر سفر کرتے رہتے۔

وہ دسمبر کی ایک ٹھٹھری ہوئی شام تھی۔ کرسمس کی آمد آمد تھی۔ ایری زونا کے گلی کوچوں میں ہلہ گلہ تھا۔ سخت سردی کے باوجود لوگ زبردست تیاریوں میں مصروف تھے۔ سویرا کو ان تیاریوں سے کیا غرض ہو سکتی تھی۔ یہ اس کا دیس نہیں تھا۔ نہ اس کا تہوار تھا' نہ اس کی شام تھی۔ ویسے بھی سویرا کے دل کا دیار تو مدت ہوئی اجڑ چکا تھا۔ بقول استاد دامن۔

عیداں تے شبراتاں آون سانوں کیہہ
لوکی جم جم جشن مناون سانوں کیہہ

اسے ان رنگ رلیوں سے کیا واسطہ ہو سکتا تھا۔ ملازمہ شکیلہ حسب عادت سویرا کی کنگھی کرتے کرتے رک گئی۔ "ہائے باجی جی! آپ کے تو بڑے بال سفید ہوگئے ہیں۔"

"تو کیا اب چالیس برس کی عمر میں کالے ہوں گے۔ تیری باجی اب بڈھی ہو گئی ہے۔"

"اونہہ' بڈھی ہوگئی ہے۔" شکیلہ نے سر جھٹکا۔ "قسم خدا کی......... آپ یہ نہ سمجھیں کہ منہ پر تعریف کررہی ہوں۔ آپ کسی طرح چالیس کی نہیں لگتی ہیں اور بات چالیس پینتالیس کی نہیں ہوتی جی' بات تو ہوتی ہے بندے کے اندر کی خوبصورتی کی۔ آپ کا اندر خوبصورت ہے' اس لئے اب بھی خوبصورت نظر آتی ہیں۔ ان میموں کو دیکھ لیں۔

یہ ہمارے ساتھ کے فلیٹ والی سوزی ہے۔ مشکل سے تیس سال کی ہوگی مگر سگریٹ اور شراب نے اس کو کھنڈر کرڈالا ہے۔"

شکیلہ بولتی تھی تو بے تکان بولتی چلی جاتی تھی۔ سویرا خاموش بیٹھی رہی۔ شکیلہ نے بڑی نفاست سے سویرا کے بالوں کا ڈھیلا ڈھالا سا جوڑا بنایا اور کلپ تلاش کرنے لگی۔ اسی دوران میں فون کی گھنٹی بجی۔ بنگلہ دیشی ملازم صداقت نے فون اٹھایا۔ انگریزی میں بولا۔ "جی میڈم' صداقت عرض کررہا ہوں......... جی جی......... کیا؟ یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟" صداقت کا رنگ زرد ہوگیا' ہاتھ پیر کانپنے لگے۔ اس کی حالت دیکھ کر سویرا لپک کر گئی تاکہ خود فون سن سکے۔ اسی دوران میں صداقت نے رونا شروع کردیا تھا۔ اس سے پہلے کہ سویرا ریسیور اس کے ہاتھ سے لیتی' رابطہ منقطع ہوگیا۔ صداقت نے روتے ہوئے کہا۔ "باجی جان! مالک کو فالج کا اٹیک ہوگیا ہے۔ وہ اسپتال میں ہیں' ان کی حالت بہت خراب ہے۔"

سویرا سکتے کی حالت میں کھڑی رہ گئی۔

ایک گھنٹے بعد سویرا نے جلالی کو انتہائی نگہداشت کے یونٹ میں شیشے کے عقب سے دیکھا تھا۔ اس کے جسم سے کئی تار منسلک تھے۔ منہ پر آکسیجن تھی۔ اس کے جسم پر اضطرابی کیفیت تھی۔ وہ کھینچ کھینچ کر سانس لے رہا تھا۔ وہ پتھر کا بت بنی کھڑی رہی اور ان درجن بھر تاروں کو دیکھتی رہی جنھوں نے جلالی کو جکڑ کر بے بس کرر کھا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ وہ اپنی مرضی سے جنبش بھی نہیں کرسکتا......... دیکھتے دیکھتے سویرا کی نظر دھندلا گئی۔ اسے یوں لگا جیسے یہ تار نہیں کسی آکٹوپس کے بازو ہیں۔ سمندر میں مچھلیاں ہی نہیں ہوتیں آکٹوپس بھی تو ہوتے ہیں۔ جلالی خود کو سمندر سے نکال کر ایک علیحدہ جھیل میں لے آیا تھا' وہ سمجھتا تھا کہ وہ ہر بڑی مچھلی کی فکر سے آزاد ہوگیا ہے لیکن یہاں اس آکٹوپس نے اس جکڑ لیا تھا۔ نتیجہ وہی نکلا تھا جو اس سے پہلے بھی سویرا نے دیکھا تھا' بے بسی' لاچاری' کمزوری' عاجزی......... ثاقب' عالم چوہدری' جلالی۔ کئی چہرے ایک ساتھ سویرا کی نگاہوں میں گھوم گئے۔ قدرت کے پاس بندۂ خاکی کو اس کی اوقات یاد دلانے کے ان گنت راستے ہوتے ہیں۔ کروڑوں اقسام کی مچھلیاں اور آکٹوپس۔

دس بارہ گھنٹے بعد سہراب جلالی مرگیا۔ سویرا کو دکھ ہونا چاہئے تھا لیکن نہیں ہو رہا تھا۔ اس کی آنکھوں سے دو چار آنسو تو نکلنا چاہئیں تھے لیکن وہ بھی نہیں نکل رہے تھے۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ اپنے شوہر کی موت کی خبر نہیں سن رہی' یہ خبر کسی پڑوسن کے شوہر کی ہے اور وہ اس کا شوہر تھا بھی کہاں؟ وہ تو ایک موقع شناس سیاست داں تھا۔ اس نے سویرا کے شاداب جسم سے اپنی موقع شناسی کی وادلی تھی اور پھر اسے پتھریلی دیواروں والے شہر میں زندہ چن دیا تھا۔ وہ تمام بچے اس نے تخلیق پانے سے پہلے ہی ختم کردیئے تھے جنہوں نے اس کی کوکھ میں پلنا تھا' گود میں کھیلنا تھا' اس کے سینے پر اپنے لبوں کی پنکھڑیاں رکھ کر اسے ماں ہونے کا احساس دلانا تھا اور ان تمام ناپید بچوں کے ساتھ زندگی میں رنگ بھرنے والے ہزارہا امکانات بھی ختم ہوگئے تھے.......... ہاں سچ تلخ ہوتا ہے اور سچ یہی تھا کہ آج اسے اپنے شوہر کے مرنے کا کوئی افسوس نہیں تھا۔

☆=========☆=========☆

سہراب جلالی کے انتقال کے بعد سویرا کے لئے حالات ایک دم ہی بہت تند و تیز ہوگئے۔ جلالی کی پہلی بیوی میڈم ناصرہ ایک دم ہی مختارِ کل کی حیثیت اختیار کرگئی تھی۔ اپنا بہت کچھ جلالی زندگی میں ہی ناصرہ اور اس کے بچوں کے نام کرگیا تھا۔ جو تھوڑا بہت ان کے نام نہیں تھا وہ بھی وہ لوگ ہڑپ کرنا چاہتے تھے۔ ان میں یہ فلیٹ بھی تھا جس میں سویرا پچھلے تقریباً اٹھارہ برس سے رہ رہی تھی۔ یہ فلیٹ جلالی سویرا کے نام کرنا چاہتا تھا' کاغذات بھی تیار ہو چکے تھے' بس انہیں فائنل کرنے کی مہلت جلالی کو نہیں ملی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ناصرہ نے جلالی کی تیسری اور سب سے چھوٹی بیوی اطالوی نژاد کیرن کو اپنے ساتھ ملایا اور سویرا کو فلیٹ سے محروم کرنے کی کوشش شروع کردی۔ ایک شاپ کا کرایہ بھی سویرا کے اخراجات کے لئے مخصوص تھا۔ یہ رقم بینک میں جمع ہوتی رہتی تھی۔ یہ جوائنٹ اکاؤنٹ سویرا اور جلالی کے نام تھا۔ اس رقم کے بارے میں بھی سویرا کو معلوم ہوا کہ ایک لمبی عدالتی کارروائی کے بغیر وہ یہ رقم اپنے استعمال میں نہیں لاسکتی۔

ناصرہ اور اطالوی نژاد کیرن کے برعکس سویرا ایک بالکل مختلف مزاج عورت تھی۔ وہ ان لوگوں میں سے تھی جنہیں نادانی کی حد تک شریف النفس اور امن پسند کہا جاتا

ہے۔ اس نے پوری زندگی اسی مزاج کے ساتھ گزاری تھی' اب وہ کیسے بدل سکتی تھی۔ اس کی قناعت پسندی کسی سے ڈھکی چھپی نہیں تھی۔ وہ روپے پیسے کو زندگی نہیں سمجھتی تھی' زندگی گزارنے کا ایک ذریعہ سمجھتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ جب وہ اپنی بڑی سوکن کی سازشوں کا شکار ہوئی اور اسے اپنے اردگرد اوچھے ہتھکنڈوں کی کھڑکھڑاہٹ سنائی دی تو وہ بڑی سیر چشمی کے ساتھ.......... درویشانہ انداز میں اپنا دامن جھاڑ کر کھڑی ہوگئی۔ اس نے سب کچھ.......... سب کچھ چھوڑنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ چند ہزار ڈالر اس کے انفرادی اکاؤنٹ میں موجود تھے۔ ان میں سے اس نے کچھ اپنے ملازمین شکیلہ اور صداقت میں بانٹ دیئے۔ باقی رقم اسے پاکستان پہنچانے کے لئے کافی تھی۔

وہ پاکستان جانا چاہتی تھی۔ قریباً بیس سال بعد اب اسے محسوس ہو رہا تھا کہ اس کی آزمائش کا ایک دور ختم ہوگیا ہے۔ اس کی بہن اپنے گھربار والی تھی۔ اس کے تین بھائیوں کی شادی ہو چکی تھی۔ دو بڑے بھائی بال بچے دار تھے۔ چھوٹا بھائی تعلیم حاصل کررہا تھا۔ اب ان کا اپنا معقول مکان تھا۔ چھوٹا موٹا کاروبار بھی تھا۔ ایک خوش آئند مستقبل تھا۔ برسوں بعد اب سویرا کے دل میں یہ خواہش سر ابھارنے لگی تھی کہ وہ اپنے ماں جائیوں کے پاس پہنچ جائے۔ اس کی تھکی ہاری روح اب سکون چاہتی تھی اور یہ سکون اسے اپنے پیاروں کے درمیان ہی مل سکتا تھا۔ ماں باپ نہیں تھے تو کیا ہوا' وہ تو تھے جنہیں اس نے گودی میں کھلایا تھا۔ جن کے دکھ چھوٹی سی عمر میں اپنے سینے پر جھیلے تھے۔ جن کے لئے اس نے زندگی ایک عذاب مسلسل کی طرح کاٹی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ وہ اپنے بازو کھول کر ان سب کو ایک ساتھ گلے سے لگائے اور اتنا روئے کہ اس کی آنکھیں بھی آنسوؤں کے ساتھ بہہ جائیں.......... ہاں وہ واپس لوٹ رہی تھی۔

☆=====☆=========☆

توقیر کارپوریشن میں ہی ملازمت کررہا تھا۔ اس کا گریڈ سترہ ہوگیا تھا لیکن بچے بھی چار ہوگئے تھے۔ اس کی کنپٹیوں کے بال سفید ہوچکے تھے.......... وہ سگریٹ پھونکتا تھا اور سوچتا تھا کہ آگے چل کر گزر بسر کیسے ہوگی؟ وہ اپنے ایک دوست کے ہاں بیٹھا تھا جب اسے فون موصول ہوا۔ فون اس کی بیوی نرگس کی طرف سے تھا' اس نے کہا۔ ''توقیر'

تمہارے لئے ایک بہت اہم خبر ہے۔"

"خیریت کی خبر تو ہے نا؟" وہ بیزاری سے بولا۔

"ہاں' خیریت کی ہے۔" نرگس بولی۔ "تمہاری بہن سویرا آپا آئی ہیں۔"

"سس........... سویرا!" توقیر کی آواز حلق میں اٹک کر رہ گئی۔ اسے اپنے کانوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔ اس نے نرگس سے تصدیق چاہی۔ اس نے تصدیق کی۔ توقیر حیرت کے عالم میں سنتا رہا۔ نرگس کہہ رہی تھی۔ "میں کمرے میں بیٹھی تھی' مجھے عدنان کے پورشن سے رونے کی آوازیں آئیں' میں نے بالکونی سے دیکھا۔ ایک چادر پوش عورت نے رخشی اور دونوں بچوں کو اپنی بانہوں میں لیا ہوا تھا اور اونچی آواز میں روئے چلی جا رہی تھی۔ میری طرح رخشی بھی حیران نظر آرہی تھی۔ پہلے تو میں ڈر گئی کہ پتا نہیں کیا بات ہے۔ پھر نیچے جاکر دیکھا تو صورت تھوڑی سی جانی پہچانی لگی۔ رخشی نے بتایا کہ یہ خود کو باجی بتا رہی ہیں۔ اسی دوران میں زلفی بھی آگیا۔ اس نے سویرا آپا کو پہچان لیا۔ وہ زلفی سے لپٹ گئیں۔ اتنا روئیں کہ ہمیں ڈر لگنے لگا۔ اب وہ دانش کے پورشن میں بیٹھی ہوئی ہیں۔ سب وہاں جمع ہیں۔"

توقیر کے کان سائیں سائیں کر رہے تھے۔ اس نے پوچھا۔ "تمہیں یقین ہے وہ سویرا ہی ہے؟"

"مجھے تو یقین ہے' باقی تم آکر خود کر لینا۔"

"اکیلی ہیں؟"

"ہمارے ہاں تو اکیلی ہی آئی ہیں۔ ابھی تک کچھ زیادہ بات چیت نہیں کی۔ بس روئے چلی جا رہی ہیں۔"

کچھ دیر گفتگو کر کے نرگس نے فون بند کر دیا۔

توقیر کے ذہن میں ہلچل سی مچ گئی تھی۔ ایکا ایکی ایک پورا دور زندہ ہو گیا تھا۔ اپنی تمام تر خوشگواری اور ناگواری کے ساتھ۔ پچھلے تقریباً پندرہ سال سے انہیں سویرا کی کچھ خبر نہیں تھی۔ پہلے تو ان کا خیال یہی تھا کہ ٹاؤن آفیسر ثاقب پاکستان سے نکلتے نکلتے سویرا کو بھی ساتھ لے گیا ہے اور وہ مڈل ایسٹ کے کسی ملک میں اپنے شوہر کے ساتھ روپوشی کی

زندگی گزار رہی ہے لیکن پھر ایک سنی سنائی بات ان کے کانوں تک پہنچی تھی اور وہ یہ کہ سویرا ثاقب سے طلاق حاصل کر چکی ہے اور اب اس نے دوسری شادی کر لی ہے۔ وہ اپنے خاوند کے ساتھ کسی یورپی ملک یا امریکا میں ہے۔ اس قسم کی باتیں سن کر توقیر اور اس کے بھائی عموماً شرمندگی محسوس کرتے تھے۔ سویرا کے بارے میں ان کا ذہن ایسے انداز سے سوچنے لگتا تھا جسے ہرگز مثبت نہیں کہا جا سکتا تھا۔

شروع کے چند برسوں میں وہ لوگ اکثر سویرا کے بارے میں باتیں کیا کرتے تھے۔ ان کو خیال رہتا تھا کہ شاید کسی دن وہ آجائے یا پھر وہ کہیں سے خط بھیجنے یا فون کرنے کی زحمت کر لے۔ مگر جب ایسا کچھ نہیں ہوا تھا تو وہ بھی آہستہ آہستہ اور بتدریج اسے بھولتے چلے گئے تھے۔ بس کبھی کبھی کسی تہوار پر یا خاندان میں کسی تقریب کے موقع پر غم ناک انداز میں سویرا کا ذکر کر دیا جاتا تھا۔ جب تک امی زندہ تھیں اکثر اشکبار ہو جاتی تھیں اور یہ اندیشہ ظاہر کیا کرتی تھیں کہ سویرا کے ساتھ کچھ ہو چکا ہے ورنہ وہ ایسی نہیں تھی کہ چند ماہ بھی ان سے ملے بغیر رہ سکتی۔ وہ اکثر توقیر کی منت کیا کرتی تھیں کہ وہ اپنی بد نصیب بہن کا پتا کرے۔ اس کا کھوج لگائے۔ توقیر کا جواب بس تین فقروں میں ہوتا تھا۔ "امی! ہم سے زیادہ ثاقب بھائی کے گھر والوں کو ان کی فکر ہے۔ وہ ہر طریقے سے کوشش کرتے رہتے ہیں۔ جب ثاقب بھائی کا کھوج لگے گا تو سویرا کا بھی لگ جائے گا۔ آپ بس دعا کیا کریں۔"

پھر ایک روز امی اپنے سینے میں ان گنت دکھ سمیٹے اس دنیا سے منہ موڑ گئی تھیں۔ امی کے بعد اس گھرانے میں سویرا کا ذکر شاذو نادر ہی ہوا تھا۔ تین چار ماہ کے وقفے سے جب پنکی میکے آتی تھی تو بس دو چار آنسو بہا لیتی تھی۔

اور آج پندرہ سولہ سال بعد وہ سن رہا تھا کہ سویرا واپس آئی ہے۔ ایک دم ان گنت اندیشے توقیر کے ذہن میں سر اٹھانے لگے تھے۔ سب سے بڑا اندیشہ یہ تھا کہ سویرا کے حوالے سے جو مناسب اور نامناسب باتیں عزیز و اقارب کی طرف سے کی جاتی ہیں ان کو پھر سے توانا آواز مل جائے گی۔ اس کے علاوہ قوی امکان تھا کہ گلی محلے میں بھی چہ میگوئیوں کا آغاز ہو جائے گا۔

گھر میں بھائیوں کے درمیان بھی کئی تنازعات موجود تھے۔ وہ پندرہ مرلے کے کشادہ مکان میں رہتے تھے مگر اب جھگڑوں کی فراوانی کے سامنے یہ مکان چھوٹا پڑ گیا تھا۔ چار بھائیوں کے لئے گھر میں تین دیواریں کھڑی کرنا پڑی تھیں۔ پندرہ مرلے کا گھر دیواریں اٹھ جانے کے سبب تین تین مرلے کی لمبوتری گلیوں کی سی شکل اختیار کر گیا تھا۔ ان دیواروں نے جہاں دلوں کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچایا تھا' وہاں مکان کو بھی بڑے بھونڈے طریقے سے تقسیم کیا تھا۔ کہیں باورچی خانے کے دو غسل خانے بن گئے تھے' کہیں راہداری بیڈ روم کی شکل اختیار کر گئی تھی اور کہیں خوبصورت ڈرائنگ روم عین درمیان سے دو ٹکڑے ہو گیا تھا۔

گھر تنگ ہوئے تھے تو دل اور تنگ ہوئے تھے۔ تینوں بھائیوں کی بیویاں ہمہ وقت جنگ میں مصروف رہتی تھیں۔ گھروں میں جگہ تنگ ہونے کی وجہ سے ہر گھرانے کے اندرونی جھگڑے بھی زوروں پر تھے۔ توقیر کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ایسے موقع پر سویرا کی آمد سے کیا صورت حال بنے گی۔ ابھی تو توقیر کو کچھ علم ہی نہیں تھا لیکن اگر وہ کچھ دن یہاں قیام کرنے کے ارادے سے آئی تھی تو اس کو کہاں اور کس کے ساتھ ٹھہرایا جا سکتا تھا۔ وہ جتنا سوچ رہا تھا' اتنا ہی الجھ رہا تھا۔ کبھی کبھی تو کسی مسئلے میں الجھ کر توقیر کا ذہن ماؤف ہو جاتا تھا۔ دراصل انسان جسمانی طور پر کمزور ہو تو ذہن بھی توانا نہیں رہتا۔ برسوں پہلے پولیس نے توقیر کے ساتھ جو "محبت" فرمائی تھی' اس کے جسمانی اثرات آج بھی توقیر پر موجود تھے۔ یہ اثرات ایک مستقل روگ کی حیثیت رکھتے تھے۔ وہ تھوڑی سی زیادہ جسمانی یا ذہنی مشقت کرتا تھا تو کمر چیخ جاتی تھی اور اسے چند گھنٹے بستر پر گزارنا پڑتے تھے۔

رات نو بجے کے لگ بھگ توقیر گھر پہنچا۔ اس نے سویرا کو دیکھا۔ اس کے بالوں میں سفیدی آ گئی تھی۔ تاہم وہ موٹی یا بھدی نہیں ہوئی تھی۔ ایک عجیب سا حزن و ملال تھا اس کے چہرے پر۔ اس نے توقیر کو گلے سے لگا لیا اور دیر تک آنسو بہائے۔ سب گھر والے ان دونوں کے گرد جمع ہو گئے۔ وقتی طور پر ہی سہی انہوں نے اپنے اختلافات بھلا دیئے تھے۔ سویرا کسی کا سر چوم رہی تھی' کسی کو گلے سے لگا رہی تھی۔ کسی کو گود میں بھینچ رہی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ وہ اس پورے کنبے کو ایک ساتھ اپنی بانہوں میں سمیٹ لینا

چاہتی ہے۔

اس رات صبح تک توقیر اور سویرا جاگتے رہے۔ سویرا نے اپنے بھائی کو اپنی ساری کہانی الف سے ے تک سنا ڈالی تھی۔ ایک لفظ بھی چھپایا نہیں تھا اس سے۔ اس کہانی میں توقیر کے لئے حیرت کے کئی پہلو تھے۔ وہ سنتا رہا اور سر دھنتا رہا۔ ثاقب اور عالم چوہدری کے گھناؤنے کردار اس کے لئے بھی ناقابل یقین تھے۔ دوسرے روز صبح سویرے عدنان کی سیکنڈ ہینڈ سوزوکی میں وہ لوگ قبرستان گئے تھے۔ اپنے امی ابو کی قبروں کے سرہانے بیٹھ کر سویرا نے دیر تک آنسو بہائے تھے۔

☆=========☆=========☆

چند دن گزر گئے۔ پھر وہی ہوا جس کا اندیشہ توقیر اور عدنان وغیرہ کے ذہنوں میں پہلے دن سے تھا۔ عزیز و اقارب میں سویرا کے بارے میں چہ میگوئیاں شروع ہو گئی تھیں۔ قریب کے ایک دو رشتے دار اسے دیکھنے بھی چلے آئے تھے۔ گلی محلے میں ابھی خبر نہیں تھی لیکن جلد ہی خبر ہونے والی تھی۔ سب کو معلوم ہونے والا تھا کہ ان کی گمشدہ بہن ایک طویل عرصے بعد گھر واپس پہنچ گئی ہے۔ ایک دن توقیر اچانک گھر گیا تو اس نے اپنی بیوی نرگس اور عدنان کی بیوی رخشی کو باتیں کرتے سنا۔ رخشی کہہ رہی تھی۔ "پہلے مصیبتیں کم تھیں جو یہ بھی آ گئی ہے۔ صبح سویرے آ کر اٹھا دیتی ہے کہ چلو اٹھو' عدنان کو دفتر سے دیر ہو جائے گی.......... بندہ پوچھے' اب تک عدنان لیٹ ہی دفتر جاتا رہا ہے۔"

نرگس نے مسکراتے لہجے میں کہا۔ "چلو بھئی' بزرگوں کو بزرگی تو جتانی ہی ہوتی ہے۔ ویسے اس کا ہر کام میں دخل دینا تو مجھے بھی اچھا نہیں لگتا۔ ابھی سے یہ حال ہے' چند روز رہ گئی تو ہمیں تو ڈنڈے سے ہانکنے لگے گی۔"

"باجی' صاف سیدھی بات ہے' میرے گھر میں تو اتنی جگہ نہیں ہے۔ نادیہ کی نئی نئی شادی ہے' نادیہ دانش کے پاس بھی آپا کا رہنا ٹھیک نہیں۔ توقیر بھائی جان سے کہہ کر اسے زلفی کے حصے میں کرا دے دیں۔"

"توبہ ہے جی' زلفی نے تو پرسوں ہی کہہ دیا تھا۔ اس کی بات بھی ٹھیک ہے۔ اس کے امتحان ہو رہے ہیں۔ تین چار دوست ہر وقت اس کے پاس موجود رہتے ہیں۔ رات

گئے تک پڑھتے ہیں وہ لوگ۔ یہ آپا جی وہاں کہاں ڈیرا لگائیں گی؟"

اس رات توقیر بڑی دیر تک سوچتا رہا۔ اس کے دماغ میں کھلبلی سی مچی ہوئی تھی۔ سویرا بہن تھی' وہ اس کے لئے دل میں نرم گوشہ رکھتا تھا مگر سویرا کی آمد نے اسے گوناگوں پریشانیوں میں الجھا دیا تھا۔ توقیر کی چھوٹی سالی اس کے ساتھ رہ رہی تھی۔ اس کی منگنی ہونے والی تھی۔ نہایت ہی اچھا رشتہ تھا۔ اگلے ہفتے مہمان آنے والے تھے۔ ایسے میں سویرا کا گھر میں پایا جانا کسی طور بھی مناسب نہیں تھا۔ بے شمار سوال جنم لے سکتے تھے۔

آئندہ چند روز میں ماحول کی گھٹن اتنی بڑھی کہ توقیر نے سویرا کو گھر سے شفٹ کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ ان کی ایک چچی شادباغ میں رہتی تھیں۔ ان کا بیٹا کام کے سلسلے میں کچھ عرصے کے لئے شہر سے باہر تھا۔ وہ گھر میں اکیلی تھیں اور چاہتی تھیں کہ کوئی ان کے ساتھ رہے۔ توقیر نے سوچا کہ کسی طرح سویرا کو چچی کے ہاں بھیج دیا جائے۔ بہرحال اس کے لئے کسی معقول بہانے کی ضرورت تھی اور بہانہ فی الحال مل نہیں رہا تھا۔ توقیر کی بیوی نرگس بے حد پریشان تھی۔ اس کی بہن کی منگنی کھٹائی میں پڑتی نظر آرہی تھی۔ نرگس مزاج کی تیز تھی۔ ایک رات وہ توقیر پر برس پڑی۔ "تم روز کہتے ہو' آج بات کروں گا' بہن سامنے آتی ہے تو منہ گھنگنیاں ڈال لیتے ہیں۔ اس کو بھی بنا بنایا کام بگاڑنے اب ہی آنا تھا۔ لوگ طرح طرح کی باتیں کررہے ہیں۔"

"تو کیا اسے دھکے دے کر نکال دوں' کوئی طریقہ تو سوچنے دو۔"

"بس تمہارے سوچتے سوچتے پانی سر سے گزر جائے گا۔ اگر تم حکم دو تو میں اس چوہدرانی کے پاؤں پڑ جاتی ہوں۔ خدا کا واسطہ دیتی ہوں کہ چند دن کے لئے ہی سہی' ہماری جان چھوڑ کر چچی کے گھر چلی جائے۔ ہم لے آئیں گے پھر اسے۔"

"دیکھو پلیز! مجھے کچھ سوچنے دو۔"

"بس ٹھیک ہے۔ تم اس ماں جائی کو رکھو گھر میں.......... اور سنتے رہو اس کی چھیل چھبیلی کہانیاں۔ میں چلی جاتی ہوں امی کے گھر۔"

☆========☆========☆

جس وقت توقیر اور اس کی بیوی میں یہ باتیں ہو رہی تھیں۔ سویرا اتفاقاً کچن میں موجود تھی۔ روشن دان کھلا ہوا تھا اور یہ آوازیں واضح طور پر اس تک پہنچ رہی تھیں۔ اس کا سارا وجود لرز رہا تھا اور آنکھوں سے آنسو بے اختیار گرتے چلے جارہے تھے۔ اس چاردیواری میں پہنچنے کے فوراً بعد وہ جس تحیر آمیز دکھ کا شکار ہوئی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ بڑھتا ہوا اب انتہا کو پہنچ گیا تھا۔ وہ جان چکی تھی کہ پُلوں کے نیچے سے بہت سا پانی بہہ چکا ہے۔ بہت کچھ بدل چکا ہے اور بہت کچھ بدلنے والا ہے۔ وہی بھائی جو ایک پل اس کے بغیر نہیں رہ سکتے تھے' اب اپنی نئی دنیاؤں میں کھو گئے ہیں۔ وہ جان گئی تھی کہ بھائیوں کے گھر میں اس کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے اور یہ بھی جان گئی تھی کہ اسے ایک اور قربانی دینا ہوگی۔ اسے ایک بار پھر اپنے پیاروں کو چھوڑ کر جانا ہوگا جس خاموشی کے ساتھ یہاں آئی تھی' اسی خاموشی کے ساتھ نکل جانا ہوگا۔ صحن کے ٹھنڈے فرش پر ننگے پاؤں کھڑے کھڑے اس کے کانوں میں نہ جانے کیوں پھر وہی بھولا بسرا نغمہ گونجنے لگا۔ ساڈا چڑیاں دا چنبہ اے۔ بابل اساں اڈ جاناں۔

اب اس گھر میں ایک پل رہنا بھی اس کے لئے دشوار تھا۔ اس نے اسی وقت بڑی خاموشی سے وہ گھر چھوڑ دیا تھا۔ بس ایک پرچہ لکھ کر میز پر رکھ آئی تھی۔

رات کو نو بجنے والے تھے۔ وہ بڑی سرد رات تھی۔ یخ بستہ ہوا نے رات کو مزید سرد کردیا تھا۔ وہ لمبی سڑک پر بس چلی جارہی تھی۔ اسے کچھ معلوم نہیں تھا کہاں جانا ہے؟ اس کے پرس میں بس چند سو روپے تھے۔ یہ روپے اسے کہاں تک لے جاسکتے تھے اور کتنے دن زندہ رکھ سکتے تھے۔ اسے کچھ علم نہیں تھا' اسے کل رات ہی تیز بخار ہوگیا تھا۔ اب جب وہ ٹھنڈی سڑک پر نکلی اور متواتر چلتی چلی گئی تو بخار کی شدت سے جسم پھنکنے لگا۔ اس کا گلا سوکھ رہا تھا' آنکھوں کے سامنے چنگاریاں سی پھوٹ جاتی تھیں۔ مگر وہ چلتی رہی۔ وہ یہ شہر چھوڑ رہی تھی۔ شاید ہمیشہ کے لئے.......... مگر اس سے پہلے ایک بار.......... فقط ایک بار وہ اپنے لاہور کی محبوب بستی جام نگر کو دیکھنا چاہتی تھی اور اس گھر کو دیکھنا چاہتی تھی جہاں اس نے اپنی عمر کے ابتدائی بیس برس گزارے تھے۔

وہ مختلف سڑکوں پر چلتی ہوئی جام نگر میں داخل ہوگئی۔ رات کے دس بج چکے تھے۔

مگر یہ گنجان بستی ابھی پوری طرح جاگ رہی تھی۔ ویسے بھی یہ ہفتے کی رات تھی۔ زیادہ بارونق' زیادہ روشن اور اٹھکیلیاں کرتی ہوئی۔ چھوٹے چھوٹے ہوٹل' دہی بڑے کے اسٹال' فروٹ کی ریڑھیاں' میوزک اور ویڈیو سنٹر.......... وہ چلتی رہی' آگے بڑھتی رہی۔ بستی کو اپنے اندر جذب کرتی رہی۔ دکانوں کے تھڑوں پر نوجوانوں کی ٹولیاں' گلیوں میں دوڑتے بچے۔ گھروں سے ابھرتی ٹی وی کی آوازیں' پھیری والے کی قدیم آواز "گرم انڈے" وہ چلتی رہی۔ بستی کو اپنے اندر جذب کرتی رہی.......... بجلی کے کھمبے' جھولتے ہوئے تار' تاروں میں الجھی پتنگیں' چلمنوں سے جھانکتے چہرے.......... اور پھر حلوائی کی دکان۔ حجام کی دکان پر جھولتے تولئے' نانبائی کے تندور کی سرخ روشنی۔ وہ چلتی رہی' بستی کو جذب کرتی رہی۔ گلی کا موڑ' حکیم صاحب کا بورڈ۔ تھری اسٹار جنرل اسٹور.......... و اور آگے بڑھی اور پھر اپنے مکان کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ اس نے ریاست ایری زونا کی فلک بوس' پُر شکوہ عمارتیں دیکھی تھیں۔ دنیا کے بہترین راستوں سے گزری تھی مگر اس راستے جیسا کوئی راستہ تھا اور نہ اس عمارت جیسی کوئی عمارت۔

وہ جانتی تھی یہ مکان بک چکا ہے۔ وہ اس مکان کے نئے مالکوں سے ایک چھوٹی سی التجا کرنا چاہتی تھی۔ انہیں بتانا چاہتی تھی کہ اس چاردیواری میں وہ بیس برس مکین رہی ہے۔ یہاں اس کی کچھ بہت قیمتی یادیں بکھری ہوئی ہیں۔ وہ اسے فقط چند منٹ کی مہلت دے دیں تاکہ وہ ان یادوں کو اپنی پلکوں سے چن سکے۔ اس نے لرزتے ہاتھ سے کال بیل کے بٹن پر انگلی رکھی۔ جس شخص نے دروازہ کھولا' وہ اجنبی نہیں تھا.......... وہ احسن تھا۔ سامنے جنرل اسٹور کے بلب سے پھوٹنے والی روشنی میں احسن کی کنپٹیوں کے سفید بال چمک رہے تھے۔ احسن کو دیکھ کر سویرا کو چکر سا آگیا تھا۔ بخار کی شدت نے بھی کام دکھایا تھا۔ وہ تیورا کر اپنے گھر کی دہلیز پر گر گئی تھی یا شاید وہ گری نہیں تھی' اسے احسن نے سنبھال لیا تھا۔

☆==========☆======☆

وہ بخار کی غنودگی میں تھی لیکن وہ جانتی تھی کہ وہ اپنے اسی مکان ہے جو اس کی یادوں کا گہوارہ ہے۔ احسن کا ٹھنڈا ہاتھ بار بار اس کی پیشانی پر آتا تھا اور یہ خوشگوار ٹھنڈک

جیسے اس کی روح تک اتر جاتی تھی۔ پھر احسن کی سرگوشی اس کے کانوں کے کہیں آس پاس ہی گونجی۔ وہ کہہ رہا تھا۔ "شاید تجھے معلوم نہیں' یہ گھر میں نے ہی خریدا تھا' یہ گھر تجھے پیارا تھا تو مجھے بھی پیارا تھا۔ تیری طرح میری بھی بے شمار یادیں اس میں بکھری ہوئی ہیں۔ ہماری سرگوشیاں اور ہماری ہنسی ابھی تک اس چاردیواری میں گونجتی ہے۔ وہ پورا دور یہاں موجود ہے جو ماضی کی دھند میں گم ہو چکا ہے جس طرح میں تم سے پیار کرتا ہوں' اسی طرح شاید میں اس گھر سے بھی کرتا ہوں۔"

"کیوں کرتے ہو مجھ سے پیار؟ اب کیا رکھا ہے مجھ میں؟"۔ وہ غنودگی کی بے خودی میں بولی تھی۔

"تم ہی میں سب کچھ ہے اور کسی میں کچھ نہیں۔" وہ بھی وارفتگی سے بولا۔

اس نے آنکھیں پھاڑ کر خود کو غنودگی کے چنگل سے نکالنے کی کوشش کر کے احسن کا چہرہ دیکھنا چاہا۔ آتش دان کی روشنی میں بس اس کے مدہم خدوخال ہی نظر آئے۔ ذہن پھر غنودگی کے اثر میں آگیا' وہ بولی۔ "تم نے ابھی شادی نہیں کی۔"

"میں نے کہا تھا نا۔ میں تمہیں خداحافظ نہیں کہوں گا۔"

وہ بڑے کرب سے بولی۔ "تم کیوں کرتے ہو ایسا' کیوں رات دن میرے دل کو مسلتے رہتے ہو۔ کیوں مجھے آزاد نہیں کرتے' کیوں میری زنجیریں کھول نہیں دیتے؟"

وہ اس کے ماتھے پر ٹھنڈی پٹی رکھتے ہوئے بولا۔ "میں تمہیں آزاد نہیں کروں گا اور نہ خود آزاد ہونا چاہوں گا۔ آخری سانس تک تمہارا انتظار کرنا ہے مجھے۔"

"مجھے معاف کر دو احسن' میرا انتظار نہ کرو۔ اب وقت بہت آگے نکل گیا ہے۔ ہم بہت پیچھے رہ گئے ہیں۔"

"میرے لئے وقت ٹھہرا ہوا ہے سویرا.......... اسی موڑ پر.......... اسی شام کے اندھیرے میں جب تم نے راستہ بدلا تھا۔"

شدید غنودگی میں اس کی ذہنی رو بھٹک رہی تھی' وہ بولی۔ "میری مدد کرو احسن۔ مجھے کہیں بھیج دو۔ بے سہارا عورتوں کا کوئی مرکز نہیں ہے یہاں؟ بے سہارا عورتوں کا مرکز.......... بے سہارا عورتوں کا مرکز.......... بے سہارا.........."

احسن کا ٹھنڈا ہاتھ اس کے لبوں پر آیا۔ ”ایسی بات مت نکالو منہ سے.......... تم بے سہارا نہیں ہو۔ تم تو کسی کا سہارا ہو‘ کسی کی زندگی ہو اور جس کی زندگی ہو وہ دونوں ہاتھ پھیلا کر تم سے اپنی زندگی مانگ رہا ہے۔ دیکھو میری طرف‘ میرے آنسوؤں کو دیکھو سویرا‘ یہ بیس برس تمہارے انتظار میں بہے ہیں۔ اس پانی نے میرے رخساروں پر گزر گاہیں بنالی ہیں‘ دیکھو میری طرف!“

”اب یہ نہیں ہو سکتا احسن! اب بہت دیر ہو چکی ہے۔ اب زندگی گزر گئی ہے۔ اب تو شام ہو رہی ہے۔“

”تمہیں شام پیاری ہے تو مجھے بھی پیاری ہے.......... میں اس شام پر ابھی اسی جگہ کھڑے کھڑے اپنا آپ قربان کر سکتا ہوں۔“

اس کا ٹھنڈا فرحت بخش ہاتھ پیشانی پر پھسلتا ہوا سویرا کے رخسار پر آگیا تھا۔ وہ محسوس کر رہی تھی‘ پوری جان سے محسوس کر رہی تھی۔ ہاتھ کی انگلیاں اس کے بالوں کی لٹ کو اس کے کان کے پیچھے اڑس رہی تھیں۔

اس نے بے چینی سے اپنے سر کو دائیں بائیں حرکت دی۔ ”مجھے مت چھوؤ احسن! میں اس قابل نہیں ہوں۔ میں نوچی کھسوٹی ہوئی عورت ہوں۔ میرے جسم پر اور روح پر گناہ کے دھبے ہیں.......... مجھ میں کچھ نہیں رکھا‘ مجھ سے دور چلے جاؤ۔“

احسن کی ٹھنڈی انگلیاں اس نے پھر اپنے دہکتے لبوں پر محسوس کیں۔ ”خاموش ہو جاؤ۔“ وہ تحکم سے بولا۔ ”میرے لئے تم اب بھی سورج کی پہلی کرن کی طرح روشن اور شفاف ہو۔ جسم کے دھبے دھل جاتے ہیں‘ روح کے داغ نہیں مٹتے اور تمہاری روح پر کوئی داغ نہیں۔ وہ ان چھوئی اور کنواری ہے..........“

”تم وقتی بات کر رہے ہو۔“

”میں زندگی کی آخری سانس تک کی بات کر رہا ہوں.......... میں دہراتا ہوں.......... میں زندگی کی آخری سانس تک کی بات کر رہا ہوں۔“

”دنیا ہنسے گی احسن..........! پلیز رحم کرو۔“

”اس دنیا نے تم کو کیا دیا ہے جس کی اتنی پروا کرتی ہو۔ ساری زندگی جن کے لئے

قربانیاں دیتی رہی ہو‘ اس کالی سرد رات میں وہ تم کو پناہ تک نہیں دے سکتے۔ میں سب جانتا ہوں سویرا! اس دنیا کے خیال کو ٹھوکر مار دو۔ ہم اس دنیا کی پروا کئے بغیر اپنی زندگی شروع کریں گے۔“

اس نے اپنے دوسرے ہاتھ میں سویرا کا ہاتھ لے لیا اور اسے دھیرے دھیرے سہلانے لگا۔ بخار کی شدت سویرا کو آنکھیں نہیں کھولنے دے رہی تھی اور شاید وہ کھولنا بھی نہیں چاہتی تھی۔ احسن اس کے قریب موجود تھا۔ وہ اس کے سانسوں کا لمس اپنے آس پاس محسوس کر رہی تھی۔ احسن کی آواز ایک الوہی صدا کی طرح اس کے کانوں میں گونج رہی تھی۔ وہ کہہ رہا تھا۔

”.......... ہاں سویرا! ہم نئی زندگی شروع کریں گے۔ ہمیں لوگوں کی پروا نہیں کرنی ہے۔ خوف اپنے خدا کا ہونا چاہئے‘ اپنے معاشرے کا نہیں۔ پھر بھی تم چاہتی ہو تو ہم کسی دوسرے ملک چلے جائیں گے۔ شارجہ میں میرا چھوٹا سا مکان ہے۔ ایک شوروم بھی ہے۔ ہم وہیں جا کر شادی کریں گے۔ اس مکان کے پیچھے باغیچہ ہے۔ وہاں گلاب اور موتیا کھلتا ہے۔ وہاں کی شام بھی بڑی اجلی اور سہانی ہوتی ہے۔ وہاں کھلے میں بیٹھ کر کھانا کھانے کا مزہ آجاتا ہے.......... تم میرے لئے بریانی پکاؤ گی نا؟؟“

وہ عجیب جذباتی لہجے میں بول رہا تھا۔ اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گر رہے تھے۔ یہ آنسو سویرا کی پیشانی پر گر کر اس کے بالوں میں سما رہے تھے۔ سویرا کسمسائی۔ پر احسن کی آواز مسلسل اس کے کانوں میں گونج رہی تھی۔ وہ اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ ”ہاں سویرا! اس مکان کے پیچھے باغیچہ ہے۔ وہاں بڑے پیارے پھول کھلتے ہیں‘ وہاں ہم تصویریں کھینچا کریں گے.......... تم میرے لئے [illegible] واری اور سیاہ سوٹ پہننا.......... پہنو گی نا؟؟“

ان لمحوں میں سویرا کو احساس ہوا کہ وہ اب تک کی زندگی میں شاید ایک لمحہ بھی اپنے لئے نہیں جی سکی! اس کی زندگی میں تین مرد آئے تھے۔ اس نے ازدواجی زندگی گزاری تھی۔ پھر بھی اسے معلوم نہیں تھا کہ پیار کیا ہوتا ہے؟ دل کے پھول کس موسم میں کھلتے ہیں؟ کس کی بانہوں میں سما کر زمین آسمان کیسے فراموش کر دیا جاتا ہے؟ اسے

کچھ خبر نہیں تھی۔ احسن کی سانسوں کا لمس اپنے اردگرد محسوس کرکے اس کے دل کے نہاں خانوں میں کہیں یہ خواہش جگنو کی طرح چمکی کہ وہ جی کر دیکھے.......... اسے لگا کہ وہ جینا چاہتی ہے' شاید اس لئے کہ وہ احسن کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دیکھنا چاہتی ہے۔ احسن کے ہاتھ کی گرفت میں اس کا ہاتھ ڈھیلا پڑ گیا۔ اس کے لب نیم وا ہو گئے۔ اس نے محسوس کیا کہ وہ نیم دراز ہے اور احسن نے اسے اپنی آغوش میں لے لیا ہے۔

========ختم شد========

ایم اے راحت

- تاریک کائنات کے مسافر (دو جلدیں) ۵۰۰/=
- معصوم چڑیل (دو جلدیں) ۴۰۰/=
- کالی قبر (دو جلدیں) ۴۰۰/=
- فرعون (دو جلدیں) ۴۵۰/=
- کالے چراغ ۲۰۰/=
- روپ کنڈ کی روپا ۱۸۰/=
- مقدس عہد ۹۰/=
- مقدس نشان ۹۰/=
- سنہری جونک ۹۰/=
- آگ کا جزیرہ ۹۰/=
- مجسمہ ۹۰/=
- ناگ دیوتا ۱۰۰/=
- مقدس خنجر ۱۲۵/=
- مہم جو ۱۵۰/=
- محافظ ۱۲۵/=
- جن زادی ۲۰۰/=
- دھند (دو جلدیں) ۳۰۰/=
- نایاب ۱۰۰/=
- احساس ۱۰۰/=
- دہشت کدہ ۱۲۵/=
- آسیب ۲۰۰/=
- سوکھے گلاب ۱۸۰/=
- کھلاڑی ۲۲۵/=
- سرفروش (دو جلدیں) ۳۲۰/=
- رازداں (دو جلدیں) ۳۰۰/=
- سامون (تین حصے) ۱۸۰/=
- سمندر کا بیٹا (تین حصے) ۱۸۰/=
- جھرنے (تین حصے) ۱۸۰/=
- شہ زور (دو حصے) ۱۲۰/=
- ہمالیہ (چار حصے) ۲۴۰/=
- بساط (چار حصے) ۲۴۰/=
- اژدھا (پانچ حصے) ۳۰۰/=
- باغی ۸۰/=
- پارس ۶۰/=
- پرواز ۶۰/=

- خون آشام
- مداری (چھ حصے) احمد اقبال ۰/=
- ہزار داستان انوار علیگی ۰/=
- پاتال (دو جلدیں) مشتاق احمد قریشی ۵۰/=
- بے پناہ شکیل صدیقی /=
- چیل کوٹھی ابن حسن عثمان آبادی ۰/=
- انکا سید غوث علی ۰/=
- سائرس اعظم اختر حسین شیخ ۰/=
- سحرزادہ وجیہہ سحر ۰/=
- راکھ ۰/=
- زنداں میں پھول ناہید سلطانہ اختر ۰۰/=
- سمن پوش ۵/=
- راکھشس ساحر جمیل سعید ۵/=
- صدیوں بعد عبدالستار آکاش ۰۰/=
- وارث اقبال کاظمی ۵/=
- دہشت گرد ۵۰/=
- شاطر ۰۰/=
- موسم بدلتے رہتے ہیں احسان الحق نازش ۲۰/=
- ٹوٹے تارے انوار احسن صدیقی ۵۰/=
- ایندھن ۰۰/=
- ایرے غیرے علی رضا احمد ۰۰/=
- بابل ونینوا اسلم راہی ۲۵۰/=
- آرزوئے دل دیبا خانم ۸۰/=
- دیوانگی ۸۰/=
- پکار مینا ناز ۸۰/=
- انتقام ۸۰/=
- آپ کی قسم ۸۰/=
- میرے حضور ۸۰/=
- آئی رضیہ بٹ ۸۰/=